قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۰ | کراچی: ہفتہ ۱۸ - جون ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

فرقے مٹنے ہیں خالص قران کی اطاعت سے اور خالص قران کی طرف دعوت سے ان لوگوں کے دلوں میں سخت کبیدگی اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ نفرت اور کبیدگی ہی نہیں بلکہ اس قدر دشمنی اور عداوت پیدا ہوجاتی ہے کہ جو شخص ان کے سامنے قران پیش کرے، ان کا جی چاہتا ہے کہ اسے جان سے ماردیں۔ واذا تتلیٰ علیهم آیتنا بینت تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر۔ اور جب ان کے سامنے ہمارا واضح قانون پیش کیا جاتا ہے تو جو لوگ (خالص قران کے) ماننے سے انکار کرتے ہیں تو دیکھیگا کہ اس انکار کی علامتیں ان کے چہرے پر کس طرح ابھر کر آجاتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ۔ یکادون یسطون بالذین یتلون علیهم آیاتنا۔ (۲۲/۷۲) قریب ہے کہ وہ ان لوگوں پر جو قران پیش کرتے ہیں جھپٹ کر حملہ کردیں۔ اور ان کے بس میں ہو تو انہیں جان سے ماردیں۔ اس جرم کی پاداش میں کہ وہ خالص خدا کی طرف دعوت کیوں دیتے ہیں۔ ان کے خود ساختہ خداؤں کی شریعت کو بھی اس کے ساتھ کیوں نہیں ملاتے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اس طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اس لئے نوع انسانی اب قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳ ہمارے ایمان و عمل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایت قرآن کے خلاف ہو ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔

۴ حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کا یہ تمام حصہ (خواہ وہ کسی کتاب میں ہو) یکسر غلط اور وضعی ہے۔ حضورؐ کی سیرت کو پرکھنے کا معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶ اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸ ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں اس قرآنی نظام ربوبیت کا قیام ہو جائے جو مستقل اقدار خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کا ضامن ہو اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں
تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ اسلامی نظام	★ پنڈت نہرو کی خارجہ حکمت عملی	★ ایک اہم سوال	★ نظام ربوبیت
★ عقل انسانی اور وحی خداوندی کے دئیے ہوئے معاشی نظام	★ تاریخی شواہد	★ اسلام کی سرگزشت	★ مجلس اقبال
★ سلیم کے نام	★ حقائق و عبر	★ بین الاقوامی جائزہ	★ عالم اسلامی	★ بزم طلوع اسلام

ابلیس و آدم

حیات کا سلسلہ ارتقاء - انسان کی تخلیق - ابلیس و آدم کی آویزش وحی کی حقیقت - مقام رسالت -

یہ اور ایسے دیگر اہم عنوانات سے متعلق تفصیلی مباحث -

ضخامت ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

اسبابِ زوالِ اُمت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

سلیم کے نام خطوط

نوجوانوں کو زندگی کے طوفان سے آشنا کرنے کی کامیاب کوشش -

صفحات ۳۰۸ قیمت چھ روپے

فردوس گم گشتہ

انسان نے کون سی جنت کھوئی اور اسے کیسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے ؟

اس سوال کا نرالا جواب

صفحات ۳۱۲ قیمت چھ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۲ - کراچی - ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸ | ۱۰ جون سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر ۲۰

اسلامی نظام

اب جبکہ ایک جدید مجلس آئین ساز زیر تشکیل ہے پاکستان کے آئین کے متعلق پھر مختلف حلقوں میں باتیں چھڑ رہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بلند آواز یہی سنائی دے رہی ہے کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہونا چاہیئے، بلکہ یہ کہ یہ نظام اسلامی ہوگا اور ہو کر رہے گا۔

جہاں تک پاکستان کے نظام کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اس کے بعد اس کا مطالبہ ہو کہ وہ جس سرزمین میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کا نظام اسلام کے خلاف ہو؟ اس میں شبہ نہیں کہ ملک میں کچھ لوگ ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جن کا خیال ہے کہ اسلامی نظام ایک وقتی پروگرام تھا جو تیرہ سو سال پہلے ایک خاص خطۂ زمین میں کچھ دنوں کے لئے رائج رہا۔ اب دنیا اس مقام سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ اس لئے اس دور میں وہ نظام قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ ان حضرات کے نظریہ، دعویٰ اور اس کے دلائل کا تجزیہ کریں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہ دراصل اس جامد نظام کو ناقابل عمل تصور کرتے ہیں جسے مولوی صاحبان عین اسلام کہہ کر پیش کرتے ہیں اور چونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کا نظام اس دور میں چل نہیں سکتا، اس لئے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسلامی نظام ایک خاص ماحول میں چل سکتا تھا۔ اب زمانہ اس سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ لہذا ان لوگوں کے اس اعتراض سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ وہ درحقیقت اسلامی نظام نہیں چاہتے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ یہ اس نظام کو آج کے ماحول میں قابل عمل نہیں سمجھتے جسے مولوی صاحبان اسلامی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اور مولوی صاحبان کی مراد بھی چند جرموں کی شرعی سزائیں یا چند فقہی احکام ہوتے ہیں۔ ایک مملکت کے نظام کا تصور ان کے ذہن میں نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے خائف ہیں کہ اسلامی نظام میں اخلاقی پابندیوں پر بہت زور دیا جائے گا۔ اور ان کی خلاف ورزی پر سخت مواخذہ ہوگا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ یہاں اس قسم کا نظام نافذ ہو۔ اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس قسم کے لوگوں کا شمار اس طبقہ میں ہوگا جو جرائم کا خوگر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے نزدیک اسلامی نظام تو ایک طرف، کسی قسم کا نظام بھی خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ چور کب چاہتا ہے کہ ملک میں تھانے قائم ہوں، میزانِ عدل نصب کی جائے۔ جیل خانے بنیں پولیس اور سپاہ رکھی جائے۔ لہذا یہ طبقہ اس باب میں درخور اعتنا ہی نہیں۔

لیکن ان دونوں طبقوں کو اگر شمار میں بھی لے لیا جائے تو ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔ اس لئے یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ ملک کی بہت بڑی اکثریت اسلامی نظام ہی چاہتی ہے۔ بنا بریں، اگر سابقہ مجلس آئین ساز کی زندگی میں ملک کے آئین و نظام کے اسلامی ہونے کے متعلق کچھ حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ یہاں مذکورہ صدر دو طبقات موجود ہیں۔ اس کا سبب کچھ اور تھا۔ اور وہ سبب یہ تھا کہ اسلامی نظام کے متعلق اس قدر شور و شغب کے باوجود یہ متعین ہی نہیں ہو سکا (نہ اب تک ہو سکا ہے) کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں؟ یہاں ہر فرقے اور ہر پارٹی کے نزدیک اسلامی نظام کا مفہوم مختلف ہے۔ آیئے! اس باب میں ذرا صاف صاف بات کریں۔ یہاں شیعہ اور سنّی بستے ہیں۔ پھر سنیوں میں اہل حدیث اور اہل فقہ ہیں۔ پھر اہل فقہ میں متشدد طبقے، مثل رضاخانی، اور معتدل طبقے مثل دیوبندی ہیں۔ اگر اس سے آگے نہ بڑھا جائے۔ اور اس تقسیم کو یہیں تک رہنے دیا جائے تو

(۱) ہم سب سے پہلے شیعہ حضرات سے دریافت کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ جس نظام کو سنی حضرات اسلامی نظام کہتے ہیں، کیا ان کے نزدیک بھی وہی نظام اسلامی ہے؟ اور

(۲) ہم سنی حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو نظام شیعہ حضرات کے تصور کے مطابق ہے کیا آپ اسے اسلامی نظام سمجھتے ہیں! پھر

(۳) ہم اہل حدیث حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں، کہ جو نظام اہل فقہ کے نزدیک اسلامی ہے، کیا وہی آپ کے نزدیک بھی اسلامی ہے؟ اور

(۴) اہل فقہ میں سے ہم دیوبندی حضرات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جس نظام کو رضاخانی حضرات اسلامی کہتے ہیں، کیا آپ بھی اسے اسلامی ماننے کو تیار ہیں؟ اور

(۵) رضاخانی حضرات سے ہم پوچھتے ہیں کہ اسلامی نظام کی جو تعبیر اہلِ دیوبند کے نزدیک صحیح ہے۔ کیا آپ کے نزدیک بھی وہ تعبیر درست ہے؟

(۶) پھر ان سب سے الگ ہم جماعت اسلامی سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اوپر کے مختلف طبقات میں سے وہ کونسا طبقہ ہے جس کی طرف سے پیش کردہ نظام کو آپ اسلامی نظام قرار دینے کے لئے تیار ہیں؟ اور اگر ان میں سے کسی کا پیش کردہ نظام بھی آپ کے نزدیک اسلامی نہیں تو پھر ہم اوپر کے تمام طبقات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ کے نزدیک جماعت اسلامی کی طرف سے پیش کردہ نظام اسلامی ہے؟

ہم قارئین سے درخواست کریں گے کہ آپ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اس کے بعد یہ کیجئے کہ ارباب مذہب میں سے جو صاحب بھی آپ کے قریب رہتے ہیں ان سے ملئے اور

(۱) ان سے دریافت کیجئے کہ اوپر کے مختلف گروہوں میں سے ان کا تعلق کس سے ہے۔ اور اس کے بعد

(۲) ان سے پوچھئے کہ ان کے گروہ کے علاوہ باقی جتنے گروہ بھی ہیں اگر ان میں سے کسی کے پیش کردہ نظام کو یہاں اسلامی نظام کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ تو کیا وہ نظام ان کے نزدیک قابل قبول ہوگا؟

آپ ان سے ان سوالات کا جواب بالکل واضح، غیر مبہم، متعین اور دو ٹوک انداز میں لیجئے۔ یہ جواب آپ کو خود بتا دے گا کہ اس باب میں حقیقت کیا ہے۔

کہدیا جائے گا کہ سابقہ آئین سازی کی کوششوں کے دوران میں ملک کے مختلف فرقوں کے اکتیس علماء نے متفقہ طور پر مطالبہ کیا تھا کہ ملک کا آئین کتاب و سنت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ان حضرات نے یہ متفقہ مطالبہ پیش کیا تھا۔ لیکن جب آپ اس مطالبہ کا خفیف سا تجزیہ بھی کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس متفقہ مطالبہ میں اتفاق کی رمق تک بھی نہ تھی۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں یوں آئے گی کہ

(۱) آپ شیعہ، سنی، اہل حدیث، اہل فقہ، دیوبندی رضاخانی اور جماعت اسلامی میں سے کسی سے پوچھئے کہ ان کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دعوٰے ہوگا کہ ان کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اس کے بعد

(۲) آپ ان میں سے کسی ایک سے (مثلاً شیعہ حضرات سے) پوچھئے کہ ان کے مقابل میں دوسرے فریق (مثلاً سنیوں) کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ صاف کہدیں گے کہ نہیں! کتاب و سنت کے مطابق مسلک صرف انہی کا ہے، فریق مقابل کا نہیں۔ اور

(۳) ان سب کو چھوڑ کر آپ جماعت اسلامی والوں سے پوچھئے کہ کیا ان کے نزدیک ان مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے؟ اگر ہر ایک کا نہیں تو وہ کونسا گروہ ہے جس کا مسلک کتاب و سنت کے مطابق ہے؟

ان جوابات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ جب ان مختلف طبقات سے متعلق علماء کرام نے یہ متفقہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ ملک کا نظام کتاب و سنت کے مطابق ہونا چاہیئے تو ان کا مطلب کیا تھا؟ مطلب صاف یہ تھا کہ ملک کا نظام اس "کتاب و سنت" (یا کتاب و سنت کی اس تعبیر) کے مطابق ہونا چاہیئے جو اس کے فرقہ کے نزدیک درست ہے۔ اگر آپ کو اس میں کوئی شبہ ہو تو آپ آج بھی ان فرقوں سے پوچھ کر دیکھ لیجئے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

کہدیا جائے گا کہ ان مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات محض فروعات میں ہیں۔ اصل کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ ذرا اس دعوے کو بھی پرکھ کر دیکھئے کہ کہاں تک صحیح ہے "اصل و فرع" کی زیادہ باریک اور لطیف بحث کو چھوڑیئے اس میں تو کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوگا کہ ایک مملکت میں سب سے اہم اور اصولی سوال یہ ہوتا ہے کہ ملک کے لئے قانون سازی کا اختیار کسے ہے اور اس اختیار کی حدود کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نظام اس بنیادی اور اصولی بات کو تو ضرور متعین کرے گا آپ اس اصولی سوال کو لے کر

(۱) شیعہ حضرات کے پاس جایئے اور ان سے پوچھئے کہ کیا نمائندگان امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنا کوئی امیر چن لیں (اور وہ امیر، امیر برحق قرار پاجائے) اور کوئی قانون بنالیں۔ یا یہ حق صرف ان کے ائمہ کرامؑ تک ہی محدود تھا۔

(۲) آپ اہل حدیث حضرات کے پاس جایئے۔ اور ان سے پوچھئے کہ کیا نمائندگان امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنالیں جو بخاری شریف کی کسی حدیث کے خلاف جاتا ہو، خواہ وہ حدیث اہل فقہ (احناف) کے نزدیک ضعیف ہی کیوں نہ ہو؟

(۳) آپ حنفی حضرات سے پوچھئے کہ کیا نمائندگان قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنالیں جو فقہ حنفی کے کسی مسلّم قانون کے خلاف جاتا ہو۔ خواہ فقہ کا وہ قانون اہل حدیث کے نزدیک خلاف سنت ہی کیوں نہ ہو؟

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ اسلامی نظام کا اصل الاصول یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ آپ

(۱) شیعہ حضرات سے پوچھئے کہ جس چیز کو سنی سنت کہتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک بھی وہی سنت ہے؟

(۲) یہی سوال آپ اہل حدیث اور اہل فقہ سے بھی کیجئے پھر

(۳) آپ ان سب سے پوچھئے کہ سنت رسول اللہؐ کہاں سے مل سکیگی۔ یعنی وہ کونسی کتاب کے اندر ہے؟ اگر وہ کہیں کہ سنت رسول اللہ نبی اکرمؐ کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ہیں۔ تو ان سے پوچھئے کہ حضورؐ کا وہ ثابت شدہ طریقہ کہاں سے ملے گا؟ اور کیا تمام مسلمانوں کے نزدیک حضورؐ کا ثابت شدہ طریقہ وہی ہے

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ آپ اس پر اچھی طرح غور کیجئے اور سوچئے کہ ان حالات میں ان حضرات کے نقطہ نگاہ کی رو سے اسلامی نظام کا کوئی متعین اور متفق علیہ نقشہ متشکل ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں (دیگر جماعتوں کا تو علم نہیں) البتہ جماعت اسلامی والے (حسب عادت) یہ کہدیں گے کہ طلوع اسلام نے یہ شاخسانہ، حکومت کے ایماء سے اس لئے چھیڑا ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ یہاں اسلامی نظام بن ہی نہیں سکتا۔ اور ان میں سے زیادہ "معتبر" لوگ شاید یہ بھی کہدیں کہ اس کے معاوضہ میں حکومت کی طرف سے اتنا روپیہ طلوع اسلام کو ملا ہے۔ آپ ان سے اتنا کہیئے کہ یہ سب کچھ درست سہی لیکن آپ اتمام حجت کے لئے ان باتوں کی وضاحت کر دیجئے جو اوپر پیش کی گئی ہیں تاکہ "حکومت" کی یہ مشئوم کوشش نامراد رہ جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ یہ بھی نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ان امور کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ طلوع اسلام خود بھی تو اسلامی نظام کا شدت سے حامی ہے۔ اور اس کے نزدیک پاکستان کے حصول کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ اور اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام کی پیش کردہ صورت سے منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا تو طلوع اسلام ان دونوں متضاد شکلوں میں توافق کی کیا راہ سمجھتا ہے؟ یہ سوال واقعی اہم ہے۔ اور اس کا جواب ہمارے ذمے ہے۔ یہ جواب آئندہ قسط میں پیش کیا جائیگا جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسلامی نظام کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ یعنی اس سے افراد مملکت پر کیا اثر پڑے گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

نہرو کی خارجہ حکمت عملی

پنڈت نہرو کے دورہ روس سے متعلق جو اطلاعات اخباروں میں اب تک شائع ہوئی ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ وہ ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں کیسا رہے گا۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں کیونکہ یہ ہندوستان کا اپنا معاملہ ہے۔ اور ہم اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ لیکن اس کا نتیجہ اس کے ہمسایوں بالخصوص پاکستان کے لئے ایسا نہیں ہوگا۔ جس کا وہ دلچسپی اور اطمینان قلب سے تصور کر سکیں۔ مثلاً ماسکو کی ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ ۸ر جون کو ایک دعوت میں روسی وزیر اعظم مارشل بلگانن نے پنڈت جی کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ "روس تین ایشیائی بڑوں — روس چین اور ہندوستان — کا ایک نیا اتحاد متشکل کرنا چاہتا ہے" اس اعلان کے مضمرات کو کما حقہ سمجھنے کے لئے ہمیں پنڈت جی کی اس پالیسی کا جائزہ لینا ہوگا۔ جو وہ بیرون ملک مسلسل اختیار کئے ہوئے ہیں۔

تقسیم سے پہلے برسر حکومت آتے ہی پنڈت جی نے قیادت ایشیا کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس خواب کی عملی تعبیر کے لئے مغربی استعماریت کی مخالفت شروع کر دی اور غیر جانبداری کا نعرہ بلند کیا۔ ان کی چال یہ تھی کہ اگر اقوام مغرب بساط ایشیا سے بے دخل ہو جائیں۔ تو ان کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور اگر وہ از خود واپس نہ جائیں تو "استعماریت" کے خلاف اور غیر جانبداری کے حق میں فضا پیدا کر کے ان کا ایشیا میں رہنا ناممکن کر دیا جائے۔ یہ مطالبات ایسے تھے جو روس اور چین جیسے اشتراکی ممالک کی طرف سے بھی پیش ہو رہے تھے۔ اس طرح ہندوستان اور اشتراکی ممالک کی پالیسی میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ ہندوستان نے اس میں دو فوائد دیکھے۔ ایک یہ کہ اس ہم آہنگی کو دیکھ کر امریکہ اس کی زیادہ سے زیادہ مدد کرے گا۔ اور دوسرے یہ کہ چین اسے حریف سمجھنے کی بجائے اپنا حلیف سمجھے گا۔ اور اس طرح اس کی قیادت کی راہ میں مزاحم نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا امریکہ نے اس خیال سے ہندوستان کو دل کھول کر مدد دینا شروع کر دی کہ شاید اس طرح وہ کمیونسٹ ہونے سے بچ جائے۔ اور چین نے اس کی اس لے جا و بے جا حمایت و تائید شروع کر دی کہ اس طرح ہندوستان رفتہ رفتہ اس کے حلقے میں آجائے گا۔ حالات کے بے لاگ مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ اس تثلیثی تگ و دو میں چین کا پلڑا بھاری رہا۔ ہندوستان مدد تو امریکہ سے لیتا رہا لیکن ساتھ چین کا دیتا رہا۔ جنوری ۱۹۵۴ء کی برلن کانفرنس، اپریل کی جینوا کانفرنس اور کولمبو کانفرنس۔ دسمبر کی بنڈونگ کانفرنس اور فارموسا سے متعلق مذاکرات اس کی بین اور ناقابل تردید شہادات ہیں۔ ہندوستان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ کوریا اور ہند چینی میں اشتراکی چین کی جنگ لڑتا بلکہ اس نے مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کی قیادت میں متشکل ہونے والی دفاعی تنظیموں کو روکنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ امریکہ نے ایک حد تک اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی اور کوریا کی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو اس خیال سے شریک نہ ہونے دیا کہ اس کا ووٹ چین کے لئے مخصوص ہوگا۔ لیکن اس نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

امریکہ کی طرف سے نیم دلانہ مزاحمت دیکھ کر ہندوستان کمیونسٹ چین کی طرف اور زیادہ جھک گیا۔ چنانچہ چو این لائی بھی دہلی آئے۔ اور پنڈت جی بھی پیکنگ گئے۔ اور وہ اس طرح گھل مل گئے کہ پنڈت نہرو کی کامیابی کو کمیونزم کی کامیابی تصور کیا جانے لگا۔ اس کا ثبوت آندھرا کے انتخابات میں ملا۔ پنڈت جی کی کانگریس پارٹی کی حریف کمیونسٹ پارٹی کی جیت یقینی نظر آتی تھی لیکن ماسکو نے کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دینے کی بجائے پنڈت جی کی پیٹھ ٹھونکی پراودا اخبار نے ایک اداریہ میں پنڈت جی کی

تائید میں لکھا ہے کہ کانگریس نے لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا۔ اس سے کمیونسٹ پارٹی کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور وہ ہار گئی۔

اس سے پہلے پنڈت جی مشرق و مغرب میں مصالحت کرانے کے زعم میں آگے بڑھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے اقوام مغرب سے یہ منوانے کی کوشش شروع کر دی کہ وہ ایک عظیم طاقت (BIG POWER) ہیں۔ چنانچہ ان کے نمائندے مسٹر کرشنا مینن جو فارموسا کے سلسلہ میں پیکنگ سے ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ ان دنوں انگلستان اور امریکہ سے اپنی یہی مزعومہ حیثیت تسلیم کرا رہے ہیں۔ عین اس حال میں جبکہ ہندوستان اقوام مغرب سے اپنی بڑائی تسلیم کرانے میں مصروف ہے۔ روس نے اس دکھتی رگ کو پکڑا ہے۔ اور ہندوستان کو ایشیا کی تیسری بڑی طاقت کہہ کر اس سے اتحاد کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ روس کی پالیسی میں جو تبدیلی آچکی ہے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو روسی قائدین راندہ درگاہ مارشل ٹیٹو سے خود ملنے جا سکتے ہیں وہ پنڈت نہرو کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

ہندوستان بڑی طاقت ہے یا نہیں۔ اور اس سے روس اور چین یا کسی اور قوم سے رابطہ اتحاد پیدا کرنا چاہیئے یا نہیں۔ یہ خالصتہً ہندوستان کے اپنے مسائل ہیں۔ اور وہ ان کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن پاکستان اور دیگر اقوام کو یقیناً حق پہنچتا ہے کہ اگر ان فیصلوں کی زد ان پر پڑتی ہو تو وہ ان کے مضمرات پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنی مدافعت کے سامان پیدا کریں۔

روس چین اور ہندوستان کے اتحاد کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان نے اپنی قسمت کو کمیونسٹ ممالک سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اشتراکیت کے لئے ہندوستان کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے۔ پہلے ہی ہندوستان میں کمیونزم کو کافی فروغ حاصل ہو چکا ہے اس کے لئے جہاں اور عوامل ہیں وہاں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو بین الاقوامی سیاست میں کمیونسٹ چین اور روس کا ساتھ دیتے ہیں تو اندرون ممالک کمیونسٹ پارٹی کو تقویت ملتی ہے کیونکہ اس سے اس کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان یوں کمیونزم کی آماجگاہ بن گیا تو اس سے نہ محض پاکستان کے لئے کمیونزم کا خطرہ حقیقی بن جائے گا بلکہ ایشیا اور مشرق وسطیٰ کا توازن قوت اس حد تک بگڑ جائے گا کہ اس کی روک تھام بالکل محال نہیں تو بہت دشوار ہو جائے گی۔

پاکستان اس صورت حال کو ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان کے راستے سے آنے والے سیلاب اشتراکیت کا شکار ہو جائے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس خطرے کو بھانپا جائے اور ہندوستان کو اس کھیل کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا جائے۔ یہ مسئلہ تنہا پاکستان کا نہیں۔ امریکہ کو بھی اسے پوری سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور اس کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی۔

ایک اہم سوال

اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور مقیم راولپنڈی نے سول جج راولپنڈی کے اس فیصلہ کو بحال رکھا ہے کہ قادیانی مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں اور ایک قادیانی خاتون ایک مسلم مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ فاضل جج نے اپنی رائے کا اظہار کیپٹن نذیر الدین کی اہلیہ کی اس درخواست کے فیصلہ کے دوران کیا ہے جس میں کہ اس نے حق مہر کی ادائیگی کے متعلق عدالت سے استدعا کی تھی۔

اس مقدمہ کے واقعات کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ کیپٹن نذیر الدین اور امتہ الکریم ایک بچے کے والدین ہونے کے باوجود بھی خوشگوار زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے اس لئے مذکورہ خاتون اپنے والدین کے گھر چلی گئی اور اس کے خاوند نے اس کے قادیانی ہونے کی بنا پر اسکو طلاق دیدی۔ چنانچہ گذشتہ سال سول جج میاں محمد سلیم نے حق مہر کے لئے ایک بعد کے مقدمہ میں یہ قرار پایا کہ ایک مسلم کے ساتھ ایک قادیانی کا نکاح غلط ہے اس لئے حق مہر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ڈسٹرکٹ جج نے اب اس فیصلہ کی تائید و حمایت کرتے ہوئے حسب ذیل فیصلہ دیا ہے۔

۱۔ اس مسئلہ پر امت کا اجماع ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۲۔ اس مسئلہ پر بھی امت متفق ہے کہ جو کوئی بھی ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتا دائرہ اسلام سے خارج ہے

۳۔ اس مسئلہ پر بھی اجماع امت ہے کہ قادیانی آنحضرت صلعم کو آخری پیغمبر تسلیم نہیں کرتے اور اسلئے قادیانی مسلمان نہیں ہوتے۔

۴۔ مرزا غلام احمد بلا شک و شبہ (جیسے کہ وہ خود اور اس کے پیغمبر اسے سمجھتے ہیں) دعویٰ کرتے ہیں کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

۵۔ جو کچھ بھی مرزا صاحب نے اپنی ابتدائی کتابوں میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے لکھا ہے اسکے نبوت کے دعوے کو جھٹلاتا ہے۔

۶۔ مرزا صاحب نے دوسرے پیغمبروں کی طرح سے ہی اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس کے اپنے اشعار درج ذیل ہیں۔

منم مسیح زماں و منم کلیم خدا
منم محمد و احمد کہ مجتبیٰ باشد

اور

میں کبھی عیسیٰ کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں ....

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص بھی نبی اور حامل وحی ہونیکا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اس کی

توثیق میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت موجود ہے

قرآن کریم۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔ الخ

حدیث:۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

(بحوالہ تسنیم ۔ ۸ رجون ۱۹۵۵ء)

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ (قریب بیس سال کا عرصہ ہوا) بہاولپور میں بھی اسی قسم کا ایک مقدمہ ہوا تھا جس نے بڑی شہرت اختیار کر لی تھی اور دیر تک چلتا رہا تھا۔ اس کے فیصلہ میں فاضل جج نے لکھا تھا کہ وہ ایک عرصہ تک اس مسئلہ پر غور کرتے رہے لیکن ان کے سامنے معاملہ صاف نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ ایک دن اتفاق سے کسی رسالہ میں انھوں نے ختم نبوت پر پرویز صاحب کا ایک مضمون دیکھا جس سے ان کے تمام شکوک رفع ہو گئے اور انھوں نے فیصلہ دیدیا کہ قادیانیوں اور مسلمانوں میں رشتہ مناکحت جائز نہیں قرار پا سکتا۔ اب یہی فیصلہ راولپنڈی کی عدالت نے دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ملت پاکستانیہ کے لئے بڑا اہم ہے۔ لیکن دو سال ادھر (پنجاب کی ختم نبوت کی تحریک کے سلسلہ میں) مفاد پرستوں اور ہنگامہ پروروں نے جس بری طرح سے اس کا جھٹکا کیا وہ ہر قلب حساس کے لئے وجہ صد تاسف ہے۔ اس میں اس قدر تباہی و بربادی کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اسقدر تھا کہ یہ مسئلہ تو اپنی جگہ ویسے کا ویسا رہا البتہ کچھ لوگ چند دن جیل میں رہ کر مجاہد اور غازی بلکہ (MARTYR) بن گئے۔

اس ضمن میں ہمارے پاس بہت سے استفسارات موصول ہو رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے۔ جس طرح عیسائی مسلمان ہو جانے (یعنی نبوت محمد رسول اللہ پر ایمان لے آنے) کے بعد ملت نصاریٰ کا فرد نہیں رہ سکتا حالانکہ وہ حضرت عیسےٰ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے اسی طرح جو شخص نبی اکرمؐ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہے وہ ملت اسلامیہ کا فرد نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ وہ نبوت رسول اللہ پر بھی ایمان کیوں نہ رکھے۔ ہمارے نزدیک قادیانیوں اور بہائیوں کی پوزیشن ایک ہی ہے۔ یہ دونوں نبی اکرمؐ کے بعد ایک جدید نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ ملت اسلامیہ کے افراد نہیں قرار دے سکتے۔

لیکن ایک اسلامی مملکت کے اندر یہ سوال ایسا ہے جس کا فیصلہ نہ کسی فرد کی رائے کر سکتی ہے اور نہ ہی کسی عالم کا فتویٰ۔ اس کا فیصلہ اسلامی مملکت ہی کر سکتی ہے اس لئے کہ جب اس مملکت کے آئین میں یہ تصریح ہوگا کہ فلاں فلاں چیز صرف مسلمانوں سے مخصوص رہیگی (مثلاً رئیس مملکت (ہیڈ آف دی سٹیٹ) صرف مسلمان ہوگا) تو اس مملکت کو اپنے آئین میں اسکی بھی وضاحت کرنی ہوگی کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ جس طرح اسے اسکی وضاحت کرنی ہوگی کہ "پاکستانی شہری" کسے کہتے ہیں۔ یہ سوال زیر ترتیب مجلس آئین ساز کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے اور مجوزہ آئین میں اسکی وضاحت کر دینا چاہیئے جب مملکت کو اسلامی کہنے کا دعویٰ کیا ہے تو پھر اس قسم کے تمام

مسائل کو سامنے رکھنے اور ان کا حل پیش کرنے کی بھی جرأت رکھنی چاہیئے۔ مسئلہ کو ٹال دینے سے وہ حل نہیں ہو جایا کرتا، جس طرح کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلّی کا وجود ختم نہیں ہو جایا کرتا۔

نظام ربوبیت

مقام مسرت ہے کہ قارئین کے حلقہ میں نظام ربوبیت کو وہی مقبولیت حاصل ہوئی جس کی ہمیں توقع تھی۔ اسوقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں ان میں اسے محترم پرویز صاحب کی بہترین تصنیف قرار دیا گیا ہے ہمارے نزدیک یہ پرویز صاحب ہی کی بہترین تصنیف نہیں بلکہ اس دور کی بہترین تصنیف ہے (لیکن شاید قرآن کی انقلابی آواز کی طرح، ہمارے دور یا کم از کم مسلمانوں کے لئے قبل از وقت)۔ ابھی ابھی ڈھاکہ سے 'ایک صاحب ذوق اور صاحب بصیرت' دوست کا خط پرویز صاحب کے نام، آیا ہے جس میں وہ رقمطراز ہیں۔

ڈھاکہ

۸ر جون ۱۹۵۵ء

نظام ربوبیت ختم کرنے میں مجھے دانستہ دیر لگی۔ جس طرح ایک بچہ مرغوب مٹھائی تھوڑی تھوڑی آہستہ آہستہ کھاتا ہے اسی طرح میں نظام ربوبیت پڑھتا رہا اور یہ خیال ہر وقت ستاتا رہا کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ اختتام پر میں نے آپ کے لئے بہت سی دعائیں کیں۔ خدا کرے وہ آپ کی رفیق عمل ہوں۔ اس بے نظیر تالیف کی محدود افادیت آپ کے لئے قابل غور ہے۔ ایک خاص تعلیمی پس منظر یا معیار کے بغیر دوسروں کے لئے اسکو جذب کرنا مشکل ہوگا۔ اگر ممکن ہو سکے اور طلوع اسلام میں اس کے اقتباس نسبتاً آسان زبان میں شائع ہو جائیں تو زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں گے۔

آپ بھی کہاں پیدا ہوئے جہاں عبث ہے تیرا ذوق کاش آپ کی فکر کو کوئی اور خطہ نصیب ہوتا تو دیکھتے وہ زیشان تاریخ کتنے انسانیت نواز ہوتے۔ ذاتی جذبات محبت و احترام سے قطع نظر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ طالب حق کے لئے یہ تالیف سورج کی دوہلی کرن کی طرح حیات بخش ثابت ہوگی۔ یقین کیجئے اس کے مطالعہ کے بعد قرآن کے اعجاز پر میرا ایمان اور پختہ ہو گیا اور جو چیز بھی منزل قرآن کی طرف لیجائے آب حیات ہے۔

کتاب کی محدود افادیت سے صاحب مکتوب کا مطلب یہ ہو کہ کتاب اس قدر ٹھوس ہے کہ اس سے صرف وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو ایک عرصہ سے پرویز صاحب کے بصیرت قرآنی کے ساتھ ساتھ چلتے آ رہے ہیں۔ جو اس پس منظر سے آشنا نہیں ان کے لئے ایسی جامع اور مختصر تصنیف سے کما حقہٗ مستفیض ہونا مشکل ہوگا اس کے لئے انھوں نے تجویز کیا ہے کہ اس کے اقتباسات کی تشریح طلوع اسلام میں مسلسل شائع کی جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب بڑی ٹھوس ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لکھی ہی ان لوگوں کے لئے گئی ہے جو طلوع اسلام میں پیش کردہ قرآنی اور مختصر کتاب کی ضرورت تھی۔ باقی رہا اسکی تشریح کا سوال سو طلوع اسلام کا ہر پرچہ اور اس پرچہ کے مندرجات کسی نہ کسی انداز میں نظام ربوبیت ہی کی تشریحات ہوتے ہیں کیونکہ یہ ہے ہی نظام ربوبیت کا علمبردار۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کی مسلسل تشریح کی الگ ضرورت نہیں۔

باقی رہا، اس کتاب میں پیش کردہ تصورات حیات کا اس دنیا تک پہنچانا جس تک ابھی تک پرویز صاحب کی آواز نہیں پہنچ سکی، تو اس کے لئے اس کتاب کا (کم از کم) انگریزی میں ترجمہ شائع کرنا پہلے ہی سے ہمارے پیش نظر ہے۔

طاؤس کی رنگینیوں کے بعد آخر میں ایک نظر اس کے پاؤں پر بھی جا پڑتی ہے۔ ہم نے کتاب کی اہمیت کے پیش نظر چاہا تھا کہ شائع بھی اسی اہتمام سے کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر اسکی کاپیاں بڑی احتیاط سے لکھوائی گئیں اور انکی تصحیح ایک بار نہیں بلکہ تین بار کرائی گئی۔ لیکن پریس میں جا کر یہ کاپیاں پلیٹوں پر سے اتر گئیں اور ان کی جسقدر تصحیح کی گئی تھی سازندے انھیں درست کرنے میں تساہل برتا۔ چنانچہ کتاب میں یہ غلطیاں بدستور رہ گئیں اور اس کا علم اسوقت ہوا جب کتاب چھپ کر سامنے آ گئی۔ اس سے ہمارے دل پر کیا گذری ہوگی، آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن اسوقت ہم سوائے اسکے کہ محترم پرویز صاحب سے بالخصوص اور قارئین سے بالعموم معذرت خواہ ہوں اور کیا کر سکتے ہیں۔ امید ہے وہ ہماری اس معذرت

عالم اسلامی

غازہ (فلسطین) میں اسرائیل کے اور مصر کے مابین کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے مبصر جنرل برنز ابتک بڑی ہوشیاری سے باقاعدہ جنگ کو روکے ہوئے ہیں لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں تک کامیاب ہو سکیں گے۔ انھوں نے کشیدگی کم کرنے کے لئے چار تجویزیں پیش کی ہیں۔ اوّل:۔ سرحد کے دونوں طرف اقوام متحدہ، مصری اور اسرائیلی افسروں کے مشترکہ ٹولے گشت لگاتے ہیں۔ دوئم۔ حملوں کی روک تھام کے لئے خاردار تار لگا دیئے جائیں۔ سوئم۔ سرحد کے پاس صرف باوردی سپاہیوں کو آنے کی اجازت دی جائے (تاکہ غیر فوجی آکر گڑبڑ نہ کر جائیں)۔ چہارم۔ جب کوئی حادثہ پیش آئے تو جانبین کے کمانڈر باہمی طور پر مل کر ان پر غور و خوض کر سکیں۔ مصر نے ان تجاویز کو اس شرط کے ساتھ مان لیا ہے کہ خاردار تار صرف انہی علاقوں میں نصب کئے جائیں جہاں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس حد کو دائمی نہ سمجھ لیا جائے۔ نیز فریقین کے کمانڈر جب بھی ملیں وہ اقوام متحدہ کے مبصر کی موجودگی میں ملیں۔ یہودی مشترکہ گروپوں کی گشت والی تجویز کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ سرحد کے قریب جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو مصر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔

صورت حال بگڑتی دیکھ کر برطانیہ نے "اسرائیل" کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اور امریکہ اور فرانس جنگ برداشت نہیں کریں گے۔ واضح رہے کہ ۱۹۵۰ء میں ان تینوں قوموں نے ایک اعلان جاری کیا تھا جس میں اس مشترکہ عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں سرحدوں کی کمی بیشی گوارا نہیں کی جائے گی۔ صحیح تر الفاظ میں اسکا مطلب یہ تھا کہ نہ "اسرائیل" کو مزید عربی علاقے غصب کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ اور نہ عربوں کو یہودی علاقوں پر قبضہ کرنے دیا جائے گا۔ یہ اعلان اور اس کا اعادہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس سے علت مرض کا مداوا ممکن نہیں کیونکہ اس کے عوامل دور رس ہیں۔ ۲۶ر جولائی کو اسرائیلی انتخابات ہوئے ہیں۔ موجودہ حکمران طبقہ کے نزدیک سرحدی علاقوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کشیدگی مفید رہے گی۔ مزید برآں یہودیوں کی نظریں آئندہ سال کے امریکی صدارتی انتخابات پر بھی ہیں۔ ان انتخابات میں یہودی ووٹ بہت اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ غازہ میں کشیدگی برقرار رکھیں تاکہ امریکہ پر دباؤ ڈالا جا سکے کہ اگر اسے یہودی ووٹ درکار ہیں تو وہ یہودی فتوحات میں حائل نہ ہو۔ نیز عربوں کے مقابلے میں ان کی فوجی اور معاشی امداد کرتا رہے۔ گویا ان حالات میں خدشہ یہی ہے کہ غازہ کا قضیہ کم از کم ایک سال تک مصر کے لئے پریشانی کا باعث بنا رہیگا۔

مصر کو تمام عرب ممالک نے یقین دلایا ہے کہ یہودی حملے کی صورت میں وہ اس کا ساتھ دیں گے۔ اس سے مصری حکمرانوں کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے اور انھوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ عربی اتحاد زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ مصر کا رویہ عراق کے بارے میں پہلے کی طرح متشدد نہیں رہا۔ اس سے مصر، شام اور سعودی عربیہ کی حمایت سے جو نیا دفاعی معاہدہ تیار کر رہا تھا اس میں تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ شام بھی پہلے کی طرح نئے معاہدہ کا پرجوش حامی نہیں رہا۔ وہ عراق کو ہاتھ سے ضائع نہیں کرنا چاہتا بالخصوص اس لئے کہ عراق عربی مفاد کا مؤید ہے اور اس کے تحفظ کے لئے مشترکہ اقدام کا قائل۔ لبنان مصالحت کی کوشش میں بدستور منہمک ہے۔ اب بعض حلقوں میں یہ کہا جانے لگا ہے کہ مصر اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر رہا ہے۔

حال ہی میں کرنل ناصر نے اعلان کیا ہے کہ وہ جنوری سے ملک میں پارلیمانی طرز حکومت کا نفاذ کر دیں گے۔ یہ اہم فیصلہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس سے پہلے اسی مسئلے پر عسکری انقلابی کونسل میں کافی سر پھٹول ہو چکا ہے۔ جنرل نجیب اس کے حق میں تھے۔ لیکن انھیں بالآخر اس کی پاداش میں ایوان حکومت سے نکلنا پڑا۔ اس فیصلے اور اس کے عملی نفاذ کا مصری سیاست پر کافی اثر پڑیگا اور اگر مصر واقعی اس پر قائم رہا تو مصری کوائف میں تبدیلیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تبدیلی اتحاد عالم اسلامی کے حق میں ہوئی تو مسلمانان عالم اس کا خیر مقدم کریں گے۔

عقلِ انسانی کے تجویز کردہ اور وحیِ خداوندی کے دیئے ہوئے معاشی نظاموں کا تقابل

مغرب کا جمہوری نظام

۱۔ کچھ طبقے ایسے ہوتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کرتے۔ اور دوسرے انسانوں کی محنت کے ماحصل پر جیتے ہیں۔ مثلاً صاحب اقتدار طبقہ، مذہبی پیشوا، صرف روپیہ لگا کر زندگی بسر کرنیوالا طبقہ

۲۔ جو شخص اپنی ہنرمندی سے جتنا مال و دولت سمیٹ لے وہ سب اس کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص اس کی ملکیت میں دخل انداز نہیں ہو سکتا۔

۳۔ بعض لوگ رزق کے بنیادی سرچشمہ زمین پر لکیریں کھینچ کر مختلف رقبوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتے ہیں اور عوام کو ان ذرائع معاش سے محروم کر دیتے ہیں۔

۴۔ ہیئتِ حاکمیہ کا فریضہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے واجبات وصول کرلے۔ یہ اس کا ذمہ نہیں ہوتا کہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ کو ان کی ضروریاتِ زندگی بہم پہونچتی ہیں۔ یا نہیں۔

۵۔ نوعِ انسانی کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر قوم اپنی منفعت اور دیگر اقوام کی تخریب کے درپے رہتی ہے۔

۶۔ عزت کے معیار اضافی ہوتے ہیں۔ جو بڑے گھرانے میں پیدا ہو جسکے پاس مال و دولت ہو۔ جو قوت فراہم کرلے وہی واجب التکریم ہوتا ہے۔ دوسرے ذلیل و حقیر ہوتے ہیں۔

۷۔ گروہ کثیر قانون بناتا ہے اور گروہ قلیل اس کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک حاکم دوسرا محکوم۔

۸۔ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ مفید یا مضر کام کرے اور جتنا مال جس طریقہ سے سمیٹ سکتا ہے وہ حاصل کرے۔ اور جیسے چاہے اس کا استعمال کرے۔ بس حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرے

روس کا اشتراکی نظام

۱۔ ہر شخص کو طوعاً و کرہاً کام کرنا پڑتا ہے۔ اور محنت کے ثمرہ میں سے اسے صرف اتنا ملتا ہے جس سے ضروریاتِ زندگی پوری ہو سکیں۔

۲۔ جس شخص کو جو کام دیا جائے وہ اسے مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ اور کام کا معاوضہ نظام خود مقرر کرتا ہے۔

۳۔ رزق کے سرچشمے نظام کی ملکیت میں رہتے ہیں اور نظام ہی طے کرتا ہے کہ پیداوار کا حصہ کس کو کتنا دیا جائے۔

۴۔ نظام روٹی، کپڑا، اور مکان کی ذمہ داری تو لیتا ہے۔ لیکن مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما سے سروکار نہیں رکھتا۔ فرد معاشرہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔

۵۔ نوعِ انسانی طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔

۶۔ بحیثیت انسان ہونے کے عزت و تکریم کا تخیل مفقود ہے۔ صرف کام کرنے کی صلاحیت کو اہمیت ہے۔

۷۔ حاکم اور محکوم کا تصور قائم ہے۔ استبداد کے ڈر سے فرد دم نہیں مار سکتا۔

۸۔ بھوکوں اور ننگوں کو دعوت دیتا ہے کہ مالداروں کو لوٹ لو۔

۹۔ زندگی کو صرف حیوانی سطح تک محدود سمجھتا ہے۔ جس میں کھانے پینے اور افزائشِ نسل سے زیادہ کوئی مقصد نہیں ہوتا، انسانی ذات، حیاتِ مستقبل اور مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں ہوتا۔

قرآنی نظامِ ربوبیت

۱۔ ہر شخص اپنا بوجھ بطیبِ خاطر خود اٹھائے گا۔ یعنی بجز ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں، ہر شخص تعمیری کام کرے گا۔ جو شخص بلا عذر کام نہیں کرے گا اس کا معاشرہ کے ثمرہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

۲۔ ہر قابلیت کا شخص پوری پوری محنت کرے گا۔ لیکن اس کے ماحصل میں سے صرف اتنا لے گا جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھے گا۔ دولت کا جمع کرنا سنگین جرم ہوگا۔

۳۔ رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہیں گے۔ بلکہ معاشرہ کی تحویل میں رہ کر ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔

۴۔ ہر فردِ معاشرہ اور اس کی اولاد کے لئے روٹی، کپڑا، اور مکان کے علاوہ مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے جملہ سامان پرورش بہم پہونچانے کی ذمہ داری نظام پر ہوگی۔ معاشرہ فرد کی تکمیل ذات کے لئے ہوگا فرد معاشرہ کی قربان گاہ پر ذبح ہونے کے لئے نہیں ہوگا۔ موجودہ زندگی کی خوشگواریوں کے ساتھ مستقبل کی زندگی کی شادابیاں بھی حاصل ہونگی۔

۵۔ پوری نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جائے گی۔ اور پوری انسانیت کی منفعت اس کے پیشِ نظر ہوگی۔

۶۔ ہر انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے قابلِ عزت و تکریم ہوگا۔ جو اپنی ذمہ داریوں کو بہتر طریق پر پورا کرے گا وہی زیادہ عزت کا مستحق ہوگا۔

۷۔ زندگی کے لئے اصولی قوانین خدا کے متعین کردہ ہوں گے۔ اور کسی انسان کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ جو گروہ اصولی قوانین کی جزئیات مشورہ سے مرتب اور نافذ کرے گا وہ خود بھی ان احکام کی اطاعت کرے گا۔

۸۔ ہر شخص کو دعوت دیتا ہے کہ اپنا فالتو روپیہ دوسروں کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے لئے دے ڈالو۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کی تجدید کے لئے

۱۔ اگر آپ کسی تعمیری کام میں حصہ نہیں لے رہے ہیں تو اس میں ضرور حصہ لیجئے۔

۲۔ اپنے موجودہ ذریعہ معاش پر غور کیجئے کہ وہ دیگر انسانوں کے لئے مفید ہے یا مضر۔ اگر مفید ہے تو اسے جاری رکھئے۔ اور پورے انہماک اور ہمت سے اس میں لگے رہیئے۔ لیکن اگر وہ مضر ہے تو اسے ترک کر دیجئے یا ترک کرنے کی کوشش فوراً شروع کر دیجئے۔

۳۔ اپنی کمائی میں سے ضروریاتِ زندگی کو کفایت شعاری سے پورا کیجئے۔ اور جو باقی بچے اسے دوسروں کی جائز ضروریات کے پورا کرنے کے لئے کھلا رکھئے۔ اس عمل سے آپکی ذات میں استحکام پیدا ہوگا۔

۴۔ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں تھوڑے اور بہت کا خیال نہ کیجئے۔

۵۔ اس طریقِ اعانت میں ساتھی تلاش کیجئے اور ان کے مشورے سے اس طریقِ کار کو وسعت دیجئے۔ اور سابقون الاولون میں شمولیت کا اعزاز حاصل کیجئے۔

۶۔ اس نظام کی بنیاد فکری تبدیلی پر ہے۔ اس لئے اس نظام کو قرآن کریم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

(نوٹ: معاشی نظاموں کا یہ تقابل محترم پرویز صاحب کی کتاب نظامِ ربوبیت سے مرتب کیا گیا ہے)

تاریخی شواہد

(۱۹)

یہ قوم دنیا سے نیست و نابود ہو گئی اور جس طرح حضرت ہودؑ نے انھیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا۔ ان کی جگہ دوسری قوم نے لے لی کہ مکافاتِ عمل کی رو سے استبدال و استخلافِ قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اٹل قانون ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۝ (۱۱/۵۷)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور مجھے تو نظر آرہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دیدے گا۔ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگراں ہے۔

حضرت ہودؑ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دیدیا تھا (جس طرح حضرت نوحؑ کو طوفان کا پیشتر علم دے دیا گیا تھا) وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے رہے۔ لیکن انھوں نے تو فیصلہ ہی یہ کر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہودؑ کہیں اسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ و برباد ہو گئے۔ اور حضرت ہودؑ اور ان کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَجَّيْنَاهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝ (۱۱/۵۸)

اور (دیکھو) جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آپہنچا۔ تو ہم نے اپنی رحمت سے ہودؑ کو بچا لیا اور ان لوگوں کو بھی بچا لیا جو اس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا۔

ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عادِ ثانیہ کہا گیا ہے۔ اور جو تباہ کر دی گئی اُسے عادِ اولیٰ۔

وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ۝ (۵۳/۵۰)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے جس نے عادِ اولیٰ کو ہلاک و برباد کر دیا۔

قوم عاد کے اس سانحہ عبرت آموز پر نگہ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر ابھر کر سطح پر نظر آرہی ہیں۔ قوم قوت و دولت اور حکومت و سلطنت کی مالک ہے۔ اور اسے اللہ کا فضل و احسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر سرکشی و تمرد پر اتر آتی ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو، اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کر لو۔ اور اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کے تابع لے آؤ۔ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھا دیا جائے گا۔ يَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وہ نہیں مانتی تو اس پر ایک رسوا کن عذاب نازل کیا جاتا ہے (لِنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ) اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے ماتحت عزت و شوکت حکومت و سطوت۔ قوت و ثروت اللہ کے انعامات ہیں اور ذلت و رسوائی کی زندگی عذاب خداوندی ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قوم نوحؑ کا جانشین بنایا گیا تھا۔

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۷/۶۹)

اور خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد اس کا جانشین بنایا۔ اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہئے کہ اللہ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تاکہ ہر طرح کامیاب رہو۔

اور جب اس نے پیغاماتِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی۔ تو اس سے کہدیا گیا کہ یاد رکھو کہ اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۝ (۱۱/۵۷)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا۔ وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور مجھے تو نظر آرہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دیگا۔ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگراں ہے۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت و حشمت کی وارث کوئی دوسری قوم بنا دی جائے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ دن بڑا "منحوس" تھا۔ جب ان پر اللہ کا عذاب طاری ہوا۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحِسَاتٍ لِنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ ۖ وَهُمْ لَا يُنْصَرُونَ ۝ (۴۱/۱۶، ۵۴/۱۹)

پھر دیکھو ایسا ہوا کہ ہم نے دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی کا عذاب چکھانے کے لئے چند منحوس دنوں میں ان پر ایک سخت آندھی بھیجدی۔ اور (یہ تو کچھ بھی نہیں ہے) بلاشبہ آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کن ہوگا۔ اور وہ (وہاں کسی قسم کی) مدد نہیں کئے جائیں گے۔

اس کو قرآن کریم نے ایک بڑا دن بھی کہا ہے

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۴۶/۲۱، ۲۶/۱۳۵)

اور (اے پیغمبر اسلام! ذرا) قوم عاد کے بھائی بند (ہودؑ) کو یاد کرو، جب اس نے اپنی قوم کو مقام احقاف (صحرائے عرب) میں (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے) ڈرایا۔ اور (کچھ اسی پر منحصر نہیں) اس سے پہلے اور اس کے بعد (اور بہت سے) ڈرانے والے (بھی) آچکے ہیں (ہاں تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ) عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار نہ کرو، مگر صرف اللہ کی (کہ وہی تمہارا حاکم اور مالک ہے) اور (دیکھو، اگر تم اپنے اس کفر و شرک سے باز نہ آئے، تو) میں تمہارے متعلق ایک بڑے دن (یوم مکافاتِ عمل) کے عذاب سے ڈرتا ہوں (کہ وہ تمہیں آگھیرے)

اس سے معلوم ہوا کہ سعد و نحس آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے برے اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے۔ تو وہ گھڑی اس کے لئے نحس ہے۔ لہٰذا سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے، ستاروں کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ سو جو محکوم و مسخر ہو۔ وہ مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی
(تمہید ۔ مسلسل)

گذشتہ اشعار میں اقبال نے بحضور رب العزت اپنی یہ آرزو پیش کی تھی کہ میری فکر کو بصیرت افروز بنا دے تاکہ میں اس کی روشنی میں راہ گم کردہ کاروانِ ملت کو پھر سوئے منزل لے چلوں اور

گرم رو از جستجوئے نو شوم　　　روشناس آرزوئے نو شوم

میں نئے نئے حقائق کی تلاش میں تیز رو ہو جاؤں اور نئی نئی آرزوؤں سے روشناس ہوتا جاؤں۔ قرآن کی رو سے زندگی ایک جہدِ مسلسل اور سعی پیہم ہے۔ جس میں انسان کو ہمیشہ مصروفِ جستجو رہنا چاہیئے۔ خارجی کائنات کی پوشیدہ حقائق کی پردہ کشائی میں مصروف اور خود انسان کی اپنی دنیا کے رازہائے مستور کے انکشاف میں منہمک۔ لیکن اس کا یہ انکشافِ حقیقت خود اپنی ذات تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اس کا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے۔ اسے اور لوگوں کو بھی دکھائے۔ اس لئے اقبال نے کہا ہے کہ میں سرگرمِ جستجو اور روشناسِ آرزوئے نو اس لئے ہونا چاہتا ہوں کہ

چشمِ اہلِ ذوق را مردم شوم　　　چوں صدا در گوشِ عالم گم شوم

میں اہلِ ذوق کی آنکھوں کی پتلی بن جاؤں۔ وہ میری وساطت سے تمام کائنات کے حقائق کو اپنے سامنے واشگاف دیکھ لیں۔ اور میں اہلِ عالم کی فکر میں اس طرح جذب ہو جاؤں جس طرح کان میں آواز گم ہو جاتی ہے۔

اقبال محسوس کرتا تھا کہ مدت ہائے دراز کی تقلید اور محکومی سے مسلمانوں میں شاعری کا درجہ کس قدر پست ہو چکا ہے، اگر فطرت کی طرف سے اسے صلاحیتِ سخن اس درجہ فراوانی سے نہ ملی ہوتی۔ تو وہ کبھی شعر کو اپنی پیغام رسانی کا ذریعہ نہ بناتا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا نثر میں کہتا (یہ الگ بحث ہے کہ وہ شکل زیادہ مفید رہتی یا نہ) لیکن اس کے سامنے پہلے ہی دن سے یہ حقیقت بے نقاب تھی کہ ہمارے ہاں متاعِ سخن بیحد جنسِ کاسد ہو چکی ہے۔ وہ اپنے فکر کی بلندی سے چاہتا تھا کہ اسے پھر سے گراں بہا بنا دیا جائے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ میں اس بصیرت کو اس لئے طلب کرتا ہوں کہ

قیمتِ جنسِ سخن بالا کنم　　　آب چشمِ خویش در کالا کنم

میں جنسِ سخن کی قیمت کو بڑھا دوں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں اس مال و اسبابِ تجارت میں خود اپنی آنکھوں کا پانی حل کر دوں اس سے اس کی چمک دمک اور قدر و قیمت بہت بلند ہو جائے گی۔ اسی کو اقبال نے دوسری جگہ "خونِ جگر" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　　عشق ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

جس پیغام میں نالۂ نیم شب اور اشکِ سحرگاہی کی آمیزش نہ ہو وہ محض "مشین کے بنے ہوئے (میکانیکل) الفاظ ہوتے ہیں۔ جن میں چمک تو ہوتی ہے۔ لیکن گداز نہیں ہوتا۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اور دل سے نکلی ہوئی بات میں اشکِ خونیں کی آمیزش ضرور ہوتی ہے۔ اسی سے اس کی قیمت بڑھتی ہے۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں یہ بصیرت اس لئے چاہتا ہوں کہ

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم　　　دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم

تاکہ میں علوم و معارف کے اسرار اور حقائق کائنات کے سربستہ رموز کو کھول کر پڑھ سکوں اور یہ کچھ مرشدِ رومی کے فیض سے ہوگا۔

اقبال پر ابتدا ہی سے رومی کا گہرا اثر تھا۔ اور یہ اثر آخر تک قائم رہا۔ یہ درحقیقت نتیجہ تھا اس ماحول کا جس میں اقبال کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہ ماحول یکسر تصوف زدہ تھا، اس لیے تصوف، اقبال کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعد ازاں قرآن اور تاریخ کے مطالعہ سے، تصوف کی اصل اور حقیقت ان پر عیاں ہوتی چلی گئی تھی، جس کی وجہ سے انھوں نے تصوف کی بڑی مخالفت بھی کی، لیکن ان کی یہ مخالفت اخلاقیاتِ تصوف (ETHICS OF MYSTICISM) تک جا کی، اس سے آگے نفسِ تصوف تک نہ پہنچ سکی۔ حالانکہ خود تصوف کا تصور ہی اسلام میں ایک عجمی پودا تھا۔ اقبال کی یہی وہ کمی ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاں جہاں ایک طرف تصوف کے خلاف اتنا کچھ ملتا ہے وہاں تصوف کے حق میں بھی بہت کچھ پایا جاتا ہے یہی وہ کشمکش ہے۔ جس کی وجہ سے اقبال کو تمام صوفیا میں سے رومی سب سے زیادہ پسند آیا۔ تصوف کے عام اخلاقیات میں عجز و انکسار بیچارگی و افتادگی، بیکسی و بے بسی، مایوسی و نا امیدی، ترکِ دنیا اور حقائق سے فرار ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس رومی کے ہاں جوش و حرارت، تیزی اور گرمی۔ ولولہ اور طنطنہ، عمل و حرکت ہے۔ اور یہ چیزیں اقبال کے پیغام سے خاص طور سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اس لئے اقبال نے رومی کو اپنا مرشد قرار دیا ہے۔ لیکن اس سے اس کے پیغام کو جو نقصان پہنچا ہے، افسوس ہے کہ اس کا اندازہ اقبال نے نہیں لگایا۔ رومی میں ہزار جوش و حرارت سہی، اس کی بنیاد تو تصوف ہی پر ہے۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تصوف یکسر غیر قرآنی تصور ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ وحی خداوندی اور عقل انسانی ہے۔ وحی خداوندی آخری بار قرآن کے اندر آچکی ہے۔ لہٰذا اب انسانی راہ نمائی کے لئے صرف عقل کی آنکھ اور قرآن کی روشنی ہے ان کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم نہیں ہے، اس کے خلاف تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ عقل کے علاوہ انسان کے پاس ایک اور ذریعہ علم بھی ہے۔ اسے باطنی ذریعہ کہتے ہیں۔ اس سے انسان پر حقائق کا انکشاف براہِ راست ہوتا ہے۔ اس کا نام ان کی اصطلاح میں کشف یا الہام ہے لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ محض نام کا فرق ہے۔ ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے الہام اور وحی میں کچھ فرق نہیں۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے بعد اس قسم کے ذریعہ علم کا عقیدہ رکھنا، ختمِ نبوت کی نقیض ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے کہیں تصوف اور الہام کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے رومی ہو یا حافظ جہاں تک نفسِ تصوف کا تعلق ہے۔ دونوں ایک ہیں۔ لہٰذا اگر اقبال نے رومی کو بھی اپنا مرشد تسلیم کیا ہے۔ تو اس سے اصل خرابی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اقبال کے پیغام میں یہ بہت بڑی کمی ہے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی بنیادی وجہ ابتدائی ماحول کے اثرات تھے جو اقبال کے لاشعور میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ نیز شاعری جسے انھوں نے اظہارِ فکر کا ذریعہ بنایا حزیں کے الفاظ میں "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" چونکہ اس کا تعلق حقائق کی بجائے لطائف سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں مضامین آفرینی کی گنجائش بڑی ہوتی ہے۔

انسان کتنا ہی اونچا کیوں نہ چلا جائے، اپنے میلانات کی دامن کشی سے بچ نہیں سکتا اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور یہ کہ انسان اپنے ہر میلان کو وحی خداوندی کے تابع رکھے اس لئے کہ ما ینطق عن الھویٰ (جذبات سے ملبند ہو کر بات کرنا) صرف وحی کا خاصہ ہے۔

حیاتِ جاوداں
ابلیس کے نزدیک اولاد کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے
لیکن
قرآن کا جواب
اس سے مختلف ہے
یہ جواب　　ابلیس و آدم
صفحات ۳۷۶　　میں ملاحظہ کیجئے　　قیمت آٹھ روپے

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات کے ضمن میں علمائے عمرانیات اور جاحظ ابن خلدون اور اندلسی کی آراء کا خلاصہ پیش کر کے ڈاکٹر احمد امین صاحب کا تبصرہ ان کی اپنی زبان سے پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد زمانہ جاہلیت میں عربوں کی حیات عقلیہ پر بحث کی گئی تھی۔ اس فرصت میں عربوں کی حیات عقلیہ اور یونانیوں کی حیات عقلیہ کا فرق واضح کیا جائیگا۔

رہ گئی نگاہ کی ہمہ گیری اور مسائل کی بنیادوں اور عوارض کا دقیق تجزیہ تو یہ بات عقل عربی کے بس کی نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ جب وہ کسی ایک چیز کی طرف دیکھتا ہے تو اپنی فکر کے ساتھ اسی میں مستغرق نہیں ہو جاتا بلکہ اس چیز کے ان چند خاص مقامات پر ہی وہ ٹھہرتا ہے جو اس کے تعجب کو ابھار سکیں۔ چنانچہ جب وہ کسی درخت کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی طرف بھی وہ ایک کُل کی حیثیت سے نہیں دیکھتا بلکہ اس میں کوئی خاص چیز ہوتی ہے جو اسکی نگاہوں کو اپنے لئے وقف کر لیتی ہے۔ مثلاً اسکے تنہ کا سیدھا ہونا یا اسکی ٹہنیوں کا خوشنما ہونا۔ جب وہ کسی باغ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنی نگاہوں سے اس باغ کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس کا ذہن اسے اس طرح پر قبول نہیں کرتا جیسے ایک فوٹوگرافی اسے قبول کرتی ہے بلکہ وہ تو شہد کی ایک مکھی کی طرح ہے کہ ایک پھول سے دوسرے پھول اور ایک کلی سے دوسری کلی کی طرف اڑتی رہتی ہے اور ہر پھول سے ایک ایک قطرہ چوستی چلی جاتی۔

عقل عربی کا یہ خصوصی امتیاز ہی وہ راز ہے جس سے ادب عربی کے — حتیٰ کہ اسلامی زمانہ میں بھی — وہ تمام نقائص اور وہ تمام خوبیاں بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہیں جو ایک دیکھنے والے کو اس میں نظر آسکتی ہیں۔

ادب عربی کے نقائص کا اندازہ تو تم اس کے کسی بھی ادبی ذخیرے کو — نظم ہو یا نثر ہو — پڑھتے ہی لگا سکتے ہو کہ اس میں کہ بقدر منطقی گہرائی یا فکری اعتبار سے کسی دقیق تسلسل کا تحفظ، معانی و مضامین میں محکم ارتباط کا فقدان، تمہیں نظر آئیگا حتیٰ کہ اگر تم ان کا کوئی سا قصیدہ اٹھا لو — خصوصاً زمانہ جاہلیت کا — اور اس میں سے بہت اشعار تم حذف کر دو یا مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر کر دو تو پڑھنے یا سننے والا، کتنا ہی بڑا ادیب بھی کیوں نہ ہو، مگر اس صورت کے کہ وہ پہلے پڑھ چکا ہوا سے قطعاً محسوس نہیں کر سکے گا۔

یہ نقص تمہیں ان کتابوں میں بھی نظر آئے گا جو خاص ادبی موضوعات پر ہی لکھی گئی ہیں۔ اگر تم جاحظ، ابن عبدربہ یا ابوہلال عسکری کی ان تحریروں کا جو انھوں نے خطابت یا اوصاف کے بارہ میں لکھی ہیں ان تحریروں سے موازنہ کرو جو ارسطو نے انہی موضوعات پر لکھی ہیں تو تمہیں دو قطعاً مختلف طبیعتیں نظر آئیں گی چنانچہ ارسطو مثلاً خطابت کا تجزیہ کرتا ہے تو یہ بیان کرتا ہے کہ بلاغت میں اس کا رتبہ کیا ہے، خطابت کی اقسام کتنی ہیں اور کیا کیا ہیں۔ خطبہ کے اجزاء کیا ہوتے ہیں، اور خطیب کس طرح بنتا ہے.... الخ وہ ان تمام امور پر ایسی ہمہ گیر نظر ڈالتا ہے کہ تمہارے سامنے خطابت کی ایک مکمل تصویر آجاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس عرب کاتب جب خطابت سے گفتگو کرتے ہیں تو سانچے میں ڈھلے ہوئے حسین و جمیل الفاظ کہیں گے۔ خطابت کے موتی بکھیرینگے جن سے کبھی بھی خطابت کی کوئی مکمل تصویر تمہارے سامنے نہیں آسکے گی۔

البتہ تمہارے لئے یہ ضروری ہے — اگر تم واقعی کوئی صحیح موازنہ کرنا چاہتے ہو — کہ مثلاً ستاگی جیسے لوگوں کو الگ کر دو جن کی طبیعتیں اور عقلیں یونانی فلسفہ سے متاثر ہو چکی۔

اسی قسم کا نقص عربی کی لٹریری کتابوں میں بھی نظر آتا ہے کیونکہ یہ کتابیں خود اب کی طبیعت سے متاثر ہوئی ہیں۔ اگر تم اغانی، العقد الفرید، البیان والتبین، یا جاحظ کی الحیوان کا مطالعہ کرو تو تمہیں کہیں کوئی ایسا موضوع نہیں ملیگا جس پر ایک مرتبہ ہمہ گیر نظر ڈالی گئی ہو۔ اور پھر اس سے متعلق تمام امور کو کہیں یکجائی طور پر جمع کر دیا گیا ہو۔ بلکہ اس کا کوئی پہلو یہاں ہے تو کوئی پہلو وہاں ہے تم ابھی ایک موضوع کو پڑھ رہے تھے کہ اچانک تمہیں معمولی سی مناسبت سے کسی دوسرے موضوع میں دھکیل دیا گیا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ کسی خاص موضوع پر اس کتاب میں کیا کچھ لکھا گیا ہے تو اس کی تلاش کرنیوالا تھک کر بیٹھ جائے گا اور کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اس کا اعتراف ضرور ہے کہ اس طرز نگارش میں کہ آدمی ایک موضوع سے دوسرے اور دوسرے موضوع سے تیسرے میں اس طرح نکلتا چلا جاتا ہے ایک قسم کی لذت اور تازگی ضرور ہوتی ہے مگر اتنی ہی بات تو کافی نہیں۔

اس قسم کی نظر ہے جس نے عربی شاعر کے سانسوں کو بھی کوتاہ کر دیا ہے وہ مکمل قصصی قصائد مہیا کر ہی نہیں سکتا اور نہ ہی اسے یہ قدرت ہے کہ وہ رزمیہ طویل نظمیں — جیسے ایلیڈ اور اوڈیسا — آپ کے سامنے پیش کر سکے۔

اس قسم کی فکر نے یقیناً انھیں کچھ فوائد بھی پہنچائے ہیں اور اس فکر نے ان کے لٹریری کارناموں کو خوبصورتی کا ایک خاص جامہ بھی پہنا دیا ہے۔ اس قسم کی نظر چونکہ کسی نہ کسی خاص جزئی شے میں منحصر ہوتی ہے اسلئے وہ کسی ایک چیز کے کسی ایک پہلو کی گہرائیوں تک اتر جاتے ہیں اور اس طرح عجیب و غریب اور دقیق تعریفات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جب کہ عموماً ان کے اشعار میں یہ چیز بھی نظر آتی ہے کہ وہ کسی ایک ہی چیز پر بار بار غور کرتے ہیں اور اس کے متعلق مختلف طریقوں سے مختلف مضامین پیدا کر لیتے ہیں لیکن ان میں ہمہ گیری اور احاطہ نہیں ہوتا۔ ان کا لٹریچر چھوٹی چھوٹی دل آویز حکمتوں اور حکیمانہ امثال سے بھرا پڑا ہے اس قسم کی چیزوں کو انھوں نے بہت دور تک محکم طریقے سے انجام دیا ہے۔ ان کی عقول اس قسم کی چیزوں سے لبریز اور انکی زبانیں ان عجائبات سے سرمایہ دار ہیں۔ ان کا ایک خطیب کھڑا ہوتا ہے اور اپنا پورا خطبہ اس قسم کی عمدہ اور چھوٹی چھوٹی ضرب الامثال اور مفید و مختصر حکمتوں سے ترتیب دے لیتا ہے اس کا ہر فقرہ کثیر معانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پورا شاہ بلوط کا درخت ننھے سے ایک بیج میں مرتکز ہو گیا ہے۔ یا فضا میں پھیلا ہوا کثیر گیس ایک قطرہ آب میں جمع ہو گیا ہے۔ اسلام آنے کے بعد اسی قسم کا ادب آگے بڑھا اور عربوں نے ایران، ہند اور روم کی اس قسم کی بہت سی حکمتوں کو اپنا لیا جن پر ہم کسی دوسری جگہ روشنی ڈالیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ عقل یونانی مثال کے طور پر اگر کسی چیز کی طرف دیکھتی ہے تو مجموعی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ اسکی تحقیق و تفتیش کرتی ہے تحلیل و تجزیہ کرتی ہے لیکن عقل عربی اسکے گرد گھومتی ہے اور مختلف قسم کے موتی مہیا کر کے ان سے ایک ہار ترتیب دے لیتی ہے۔

اب جبکہ ہمیں عقل عربی کی طبیعت معلوم ہو چکی ہے — ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا اس قسم کی نظر وہ طبعی طریقہ ہے جس سے تمام قومیں ہی کمال کی طرف سے بڑھتے ہوئے گذرتی ہیں یا یہ خاص قسم کی عقلیت ہے جو سامی جنس کے ساتھ مخصوص ہو۔

یہ موضوع یقیناً اس قابل ہے کہ اسکی تحقیق کی جائے۔ ہمارے پاس اتنا مواد موجود نہیں کہ ہم تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کر سکیں البتہ اجمالاً ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا میلان اس طرف ہے کہ یہ ایک طبعی طریقہ ہے جو ان طبعی اور اجتماعی احوال و ظروف سے پیدا ہوتا ہے جس میں عربوں نے زندگی بسر کی ہے۔ جس چیز کو وراثت کہتے ہیں وہ ان احوال و ظروف کے نتائج کی وراثت ہی ہوتا ہے اگر کوئی دوسری قوم ان جیسے حالات و کوائف میں سے گذرتی ہوتی تو ان کی عقلیت بھی اسی طرح کی ہوتی۔ اسکی سب سے بڑی دلیل محققین کے وہ ثبوت ہیں جو انھوں نے ان اقوام و ملل کے درمیان جو ایک جیسے یا ملتے جلتے احوال و ظروف میں زندگی بسر کرتی ہیں اخلاق اور عقلیتوں میں قوی مشابہت کے لئے پیش کئے ہیں۔ چونکہ عرب لوگ صحرا نشین تھے اسلئے ان کو صحرا نشینوں سے عقل اور اخلاق میں زیادہ مشابہت حاصل تھی جو دنیا کے دوسرے خطوں میں موجود تھے۔ اس کے بعد ہم ان عوامل کی تشریح کرتے ہیں جو عربوں کے نفوس میں کام کرتے آئے تھے

قوموں کی عقلیت کو بنانے میں دو قوی عامل ہوتے ہیں جو کام کرتے ہیں۔ (۱) طبعی حالات — اس سے ہماری مراد وہ نہریں، پہاڑ، صحرا وغیرہ ہیں جو طبعی طور پر کسی قوم کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہوتے ہیں — اور (۲) اجتماعی کوائف — اس سے ہماری مراد وہ اجتماعی نظم ہے جو کسی قوم کو محیط ہوتا ہے۔

سلیم کے نام

اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

مجھے یاد پڑتا ہے سلیم! کہ تم نے اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہ سوال پوچھا تھا لیکن غالباً یہ اس زمانے کی بات ہے جب تم تعطیلات میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ بہرحال چونکہ سوال بڑا اہم ہے اسلئے اس کا بار بار دل میں پیدا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ مختصراً تمہارا سوال یہ ہے کہ اگر اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا اور اس کا نظام نوعِ انسانی کے لئے اسقدر نفع بخش تھا تو یہ تھوڑی سی مدت کے لئے چل کر کیوں رہ گیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا؟ قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دوں ضروری سمجھتا ہوں کہ خود تمہارے سوال کی کمزوری تم پر واضح کر دوں۔ تم کہتے ہو کہ اگر

(۱) اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا۔ اور

(۲) اس کا نظام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش تھا،

تو یہ ہمیشہ کے لئے قائم کیوں نہ رہا۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ جو چیز (۱) حقیقتِ ثابتہ ہو یا (۲) نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو، وہ بالضرور از خود قائم رہتی اور آگے چلتی رہتی ہے۔ تم اگر ذرا بھی غور کرتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ تمہارا یہ کلیہ درست نہیں۔ تم جانتے ہو کہ سچ (TRUTH) ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ایسی حقیقتِ ثابتہ کہ اس کے ایسا ہونے میں کبھی کسی زمانے میں کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود تم دیکھتے ہو کہ انسانوں نے بہ حیثیت مجموعی آج تک سچ بولنا اختیار نہیں کیا۔ زور زورہ ہمیشہ جھوٹ ہی کا رہا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ عدل و انصاف نوعِ انسانی کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ اس کی نفع بخشیوں میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا۔ لیکن انسانیت کی تاریخ میں خالص عدل و انصاف پر مبنی نظام (چند لمحات کے علاوہ) کب قائم ہوا ہے؟ لہٰذا، تمہارا یہ کلیہ درست نہیں کہ حقیقتِ ثابتہ یا نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش نظام کو از خود آگے بڑھنا اور قائم رہنا چاہیئے۔ اگر وہ قائم و دائم نہیں رہا تو وہ حقیقتِ ثابتہ یا نفع بخش نظام نہیں تھا، یہ ہو تمہارے سوال کی بنیادی غلطی۔ اس کے بعد اصل موضوع پر آؤ کہ اسلام، مسلسل آگے کیوں نہ چلا۔ اس کا نظام (تمہارے تصور کے مطابق) تھوڑی دور چلکر ختم کیوں ہو گیا!

میرا خیال ہے کہ تمہیں اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ ہر انقلابی آواز قبل از وقت آتی ہے۔ "قبل از وقت" سے مراد یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ آواز اٹھتی ہے۔ اس زمانے کی سطح اس آواز سے نیچے ہوتی ہے۔ زمانے کو اس سطح تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ اگر وہ آواز اس زمانے کی سطح کے برابر ہی ہو تو وہ انقلابی ہو ہی نہیں سکتی، وہ تو اس سطح اور اس فضا کی پیداوار ہوگی۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا کرتے ہیں کہ انقلابی آواز کے لئے اس کا دور ساز گار نہیں ہوتا۔ "سازگار نہیں ہوتا" سے مراد یہ ہے کہ اس دور کے انسان اس آواز کو اچھی طرح (APPRECIATE) نہیں کر سکتے۔ ان کی ذہنی، فکری، تمدنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ اس غیر معمولی آواز سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ وہ آواز ان کے لئے بڑی نامانوس ہوتی ہے اسی لئے وہ اسکی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نابغہ (GENIUS) اپنے زمانے کے ہاتھوں اپنی ناقدر شناسی کا رونا روتے مر جاتا ہے۔ تم اپنے محبوب غالب کو دیکھو۔ وہ کس طرح اپنے زمانے کی پستی سطح کا شکوہ سنج ہے۔ کہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ۔ مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست۔ کہیں اپنی اس دشواری کا گلہ خواں ہے کہ گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل۔ لیکن چونکہ حقیقت شناس نگاہ رکھتا ہے اور اپنی قدر و قیمت سے خوب واقف ہے اس لئے نہایت حتم و یقین اور خود اعتمادی سے یہ کہکر اپنے دور کو ٹھکرا دیتا ہے کہ۔ قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعد من خواہد شدن۔ یہی کچھ اقبال کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی اپنے آپ کو "گلِ نخستین، آدم اول" اور "شاعرِ فردا" کہتا ہوا چلا گیا اور اپنے دور کی پستیِ سطح (یا اپنی آواز کے قبل از وقت ہونے کا) ان الفاظ میں اعلان کر گیا کہ۔

ولیکن کس ندانست ایں مسافر۔ چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اور غالب ہی کی طرح پیشگوئی کر گیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگا ہے

اور ایک غالب اور اقبال ہی پر کیا موقوف ہے۔ یہ جو تمہیں آج مختلف ممالک کی تاریخ میں آسمانِ فکر و ادب کے درخشندہ تارے نظر آ رہے ہیں، ان سب کے ساتھ ان کے زمانے نے یہی کچھ کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے تک کے محتاج رہے۔ محتاج ہی نہیں رہے بلکہ ان کی زندگی اکثر قید و بند میں گذری اور مصائب و آلام کا شکار رہی۔ وہ گمنامی کی زندگی جئے یا بدنامی کی موت مرے۔ لیکن مرنے کے بعد آنے والے زمانے نے ان چیتھڑوں گدڑیوں تک کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر نکالا جن میں انھوں نے زندگی کے دن کاٹے تھے اور انھیں اپنے عجائب گھروں کی یادگار اور پرستش گاہوں کی زینت بنایا ان کا ایک ایک لفظ سونے کے حروف میں لکھا اور جواہرات کے ترازوؤں میں تولا گیا۔

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! ذرا اس زمانے کی علمی، ذہنی، فکری، معاشی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور عمرانی سطح پر غور کرو جس میں قرآن آیا اور اس کے بعد اس انقلاب آفریں پیغام کو دیکھو جو قرآن لایا، تمہیں خود معلوم ہو جائیگا کہ وہ پیغام اس زمانے کی سطح سے کسقدر اونچا اور اس دور سے کتنا آگے تھا۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں دنیا کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے مفکرین سے لیکر عام انسانوں تک مندروں اور قربان گاہوں، معبدوں اور خانقاہوں کی پر اسرار اعجوبہ پرستیوں کے شکار اور راہبوں اور پجاریوں، منتریوں اور کاہنوں کے دامِ تزویر کے اسیر تھے اور انھیں کو دربارِ خداوندی کے براہ راست کارپرداز تصور کرتے تھے اس زمانے میں یہ آواز کہ انسان اور بندے کے درمیان کوئی تیسری طاقت حائل نہیں کس قدر زمانے کی سطح سے اونچی تھی۔

جس زمانے میں ساری دنیا کا معمول یہ تھا کہ راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور شہنشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتی اور ان کی اسی نہج سے پرستش کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ پکار کہ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اور یہ کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں، اس دور کے کان کے لئے کس قدر ناآشنا اور اس زمانے کے قلب کے لئے کتنی نامانوس تھی۔

جس زمانے میں عزت کا معیار نسلی تفوق، شرف و مجد کا معیار خاندانی اور قبائلی نسبتیں، اور قیادت و سیادت کا مدار حسب نسب پر سمجھا اور مانا جاتا ہو اور ان امتیازات کے استحکام و بقا کے لئے ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور ایسا کرنے میں ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر ملک اور ہر قوم انتہائی فخر محسوس کرے، اس زمانے میں یہ پیغام کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا ہے اور عزت و تکریم کا معیار اس کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ آبائی انساب۔ کس قدر اجنبی اور "غیر فطری" تھا!

جس دور میں انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چار دیواریوں اور قوموں کی حد بندیوں کی رو سے ہوتی تھی اور وطن اور قوم کی خاطر جان دینا زندگی کا مقدس ترین فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں یہ دعوت کہ انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل، وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک سے نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی رو سے ہوتی ہے، کسقدر ناقابلِ فہم اور ماورائے سرحدِ ادراک تھی!

جس زمانے میں حالت یہ تھی کہ انسان نے، فطرت کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر تغیر کے لئے ایک الگ "خدا" تجویز کر رکھا تھا جس کی خوشنودی اور ناراضگی ہر خوش آئند یا الم انگیز واقعہ کا موجب بنتی تھی، اس زمانے کے انسان سے یہ کہنا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں ہر معلول (EFFECT) کے لئے ایک علت (CAUSE) اور ہر سبب کے لئے ایک مسبب ہے اور یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قاعدے کے مطابق ہوتا ہے جس میں کبھی کسی کے لئے کوئی استثنا نہیں ہوتی، کتنا بڑا محیر العقول تصور اور کیسا ناقابلِ تسلیم دعوےٰ تھا۔

جس زمانے میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ موہوم قوتوں کے سامنے بے دست و پا سمجھ کر اپنے آپ کو قدم قدم پر مجبور و مقہور پاتا تھا، اس زمانے میں انسان کو یہ کہنا کہ ان موہوم قوتوں کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی تمام موجود قوتیں اس کے لئے تابع فرمان

کردی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا کام لے' ایک ایسی آواز تھی جس پر کوئی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھا

جس زمانے میں انسان کی علمی سطح کا یہ عالم تھا کہ گاؤں میں جو شخص دس سے اوپر گنتی جانتا اسے مافوق البشر تصور کیا جاتا، اس زمانے میں اور تو اور خود پیغمبر کے متعلق یہ اعلان کہ وہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے' انسان کے ذہن میں سمانے والی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

جس زمانے میں یہ ایک مسلّمہ تھا کہ مقدس بزرگ وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی شعبدہ سرزد ہو' اس زمانے میں یہ کہنا کہ ہم نے پیغمبر تک کو بھی کوئی معجزہ نہیں دیا اور کسی دعویٰ کے جھوٹے اور سچے ہونیکا معیار یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس کے متعلق کیا کہتی ہے اور اس کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' ایک ایسی بات تھی جسے "عقل" تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی! پیغمبر اور معجزہ ہی کوئی نہیں! مذہب کی باتیں اور ان کا مدار عقل و بصیرت پر!! شریعت کی رسومات اور ان کی پرکھ نتائج کی رو سے!!! اسے اگر جنون بھی نہ قرار دیتے تو اور کیا کہتے۔

جس زمانے میں مزدور (LABOURER) تو ایک طرف' غلام (SLAVE) تک کو فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہو' اس زمانے میں یہ آواز اٹھانا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کا مالک بن بیٹھے' "پاگل پن" کی بات نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟

اور جس زمانے میں قارون کی سی دولت کو خدا کا فضل قرار دیا جاتا ہو۔ زمینداری اور جاگیرداری کو فطرت کا عطیہ ٹھہرایا جاتا ہو اور ذاتی املاک مقبوضات پر کسی قسم کی حدبندی خلاف قانون و شریعت قرار پاتی ہو اس زمانے میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ دولت جمع کرنا بدترین جرم ہے۔ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما' معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے کس قدر تحیر انگیز آواز ہوگی؟

ذرا غور کرو سلیم! کہ چھٹی صدی عیسوی میں اس قسم کے تصوراتِ حیات اور اس انداز کے نظریاتِ زندگی' اس وقت کے ذہنِ انسان کے لئے کس قدر نامانوس تھے۔ یہ وہ انقلاب آفریں تصورات تھے جنہیں اپنانے کے لئے زمانہ ابھی تیار ہی نہیں تھا۔ دنیا ان سے ابھی بہت پیچھے تھی۔ وہ تو خیر پھر بھی چھٹی صدی عیسوی تھی جسے ازمنۂ مظلمہ کہتے ہیں' قرآن کے انقلابی تصورات کا تو یہ عالم ہے کہ خود ہمارا زمانہ' یہ بیسویں صدی جسے تہذیب و تمدن اور علم و عقل کا بلند ترین مظہر سمجھا جاتا ہے' یہ بھی ابھی ان کی ایک تصورات سے ہنوز بہت پیچھے ہے۔ ان تصورات کی سطح اتنی بلند ہے کہ ابھی زمانہ کو نہ معلوم ان تک پہنچنے کے لئے کتنی منزلیں اور طے کرنی پڑیں۔ ان حالات میں تعجب انگیز بات یہ نہیں کہ قرآن کا پیش کردہ نظام (تمہارے تصورات کے مطابق) زیادہ عرصے تک چلا کیوں نہیں۔ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں اتنے لوگ کس طرح پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے زمانے کی سطح سے اتنے بلند اور نامانوس تصورات کو اپنا لیا اور انہیں عملاً متشکل کر دیا۔ سلیم! جب میں اس مسئلہ کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں تو اس قوم (عرب) کی صلاحیتوں کے خیال سے' جس نے اس زمانے میں ایسے افراد پیدا کر دیئے' محوِ حیرت ہو جاتا ہوں اور اس ذاتِ اقدس و اعظم کی تحیر انگیز تعلیم و تربیت کے حسنِ تصور سے میری روح وجد میں آ جاتی ہے جس نے اس دور میں ایسے افراد تیار کر لئے جنہوں نے اس قسم کے نظام کو بنا کر دکھا دیا۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ جن حالات میں دنیا کا ماہر نابغہ (GENIUS) اپنے زمانہ کی قدر ناشناسی کا رونا رو کر اور اپنے آپ کو "آنے والے زمانے کا انسان" کہہ کر چلا جائے' حضورؐ ان حالات میں یہ کہیں کہ خیر القرون قرنی۔ سب سے بہتر میرا زمانہ ہے جس میں اس قسم کا انقلاب آفریں نظام' جو زمانہ کی سطح سے منزلوں اونچا ہے' اس حسن و خوبی سے متشکل ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اگر تم' سلیم! اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھو تو حضور نبی اکرمؐ' تمام دنیا کے انقلابی قائدین میں سب سے آگے اور سب سے اونچے نظر آئیں گے۔ ذرا سوچو کہ ان تصورات کو جن تک زمانہ تیرہ سو سال میں بھی کما حقہٗ پہنچ نہیں سکا' نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ذہن نشین کرانا بلکہ انہیں ان کے ہاتھوں سے عملاً متشکل کرا دینا' اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ کتاب و حکمت کی ایسی حقیقت کشا اور محیر العقول تعلیم اور انسانی صلاحیتوں کا اس قدر ناقابلِ تصور تزکیہ (نشوونما) اسی قسم کے معلم و مربی کے ہاتھوں عمل میں آ سکتا تھا۔ یہی تھا حضورؐ کا وہ عدیم النظیر کارنامہ جس پر خدا اور کائنات کی تمام تعمیری قوتیں غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرتی تھیں۔ (اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۳۳/۵۶) اور حضورؐ کے ساتھ اس جماعتِ مومنین کے لئے بھی جو ساری دنیا سے الگ ہٹ کر اور اپنے زمانے کی سطح سے منزلوں بلند ہو کر اس قسم کے ناممکن التصور نظام کو عملاً متشکل کر رہے تھے۔ (ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ ۳۳/۴۳) سوچو سلیم! اس زمانے میں (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) قریش کے مرکز مکہ کے اندر اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور عجم (فارس) کا ایک "حامی" (سلمانؓ) روم کا ایک مزدور (صہیبؓ) اور حبش کا ایک غلام (بلالؓ) نہ صرف ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے بلکہ باہمی رشتے ناطے بھی کرتے تھے' کس قدر محیر العقول تھا۔ پھر اس معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا کر دینا کہ اور تو اور خود رسول اللہؐ جب کسی غلام اور لونڈی سے بھی کوئی بات کہتے تو وہ بغیر کسی جھجک کے پوچھ لیتے کہ حضورؐ آپ ایسا وحی کی رو سے فرماتے ہیں یا یہ آپ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپ فرماتے کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو وہ نہایت آزادی سے کہہ دیتے کہ معاف فرمایئے! اس باب میں میرا فیصلہ کچھ اور ہے اس لئے میں اس مشورہ کو نہیں مان سکتا۔ کتنا بڑا تھا یہ انقلاب جو ذہنیتوں میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ امورِ مملکت میں ایسا نقشہ پیدا کر دینا کہ اگر کسی دوسرے کی رائے زیادہ بہتر ہے تو امیرِ مملکت (نبی اکرمؐ) اسے خود اپنی رائے پر ترجیح دیتے اور بڑے بڑے اہم معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے' کتنی بڑی تبدیلی کا آئینہ دار تھا۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ کا پورے مجمع سے یہ کہنا کہ جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ اس کا خدا مر گیا ہے۔ لیکن جو خدائے حی و قیوم کا پرستار ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا خدا زندہ و پائندہ ہے۔ محمدؐ خدا کے ایک رسول تھے۔ وہ اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ اس سے اس نظام پر کچھ اثر نہیں پڑتا جسے حضورؐ نے قائم کیا تھا۔ سوچو سلیم! کہ یہ آواز اس زمانے میں کتنی قبل از وقت تھی۔ پھر حضورؐ کی وفات پر لوگوں کا جمع ہو کر اپنے میں سے ایک امیر چن لینا اور بلا لحاظِ قرابت و وراثت حسب کا اسے امیر تسلیم کرنا اس دور کے ذہنِ انسانی کے لئے کس قدر نامانوس واقعہ تھا! اور خود رسول اللہؐ کا اعلان کہ میرے گھر میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں۔ اور جو اشیائے مستعملہ میں چھوڑ رہا ہوں' اس کا کوئی وارث نہیں۔ وہ تمام ملت کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اس زمانے کے لئے کس قدر تحیر انگیز تھا۔ حضرت ابا بکر صدیقؓ کا' بہ حیثیت امیر المومنین' صرف اتنا کفاف (روزینہ) لینا جتنی ایک مزدور کی اجرت ہوتی ہے' اور اپنی وفات کے وقت اس رقم کو بھی بیت المال میں یہ کہہ کر واپس داخل کر دینا کہ معلوم نہیں میں اس رقم کے برابر کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں! اس زمانہ کی سطح سے کس قدر اونچا فیصلہ تھا؟

حضرت عمرؓ کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ قیصر کی بیوی نے (تمہارے عطر کے تحفہ کے بدلے میں) جو جواہرات بھیجے ہیں وہ بہ حیثیت امیر المومنین کی بیوی کے بھیجے ہیں نہ کہ تمہاری ذاتی حیثیت سے اس لئے انہیں بیت المال میں داخل کرنا چاہیئے' اس زمانے کی فضا میں کس قدر تعجب انگیز سی بات تھی! اور ان کا یہ فیصلہ کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہنی چاہئیں' تاکہ اس سے موجودہ اور آنے والی نسلیں یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں' اس دور کے لوگوں کے لئے کس قدر حیرت افروز تھا! پھر وادی شام کی اس بڑھیا کا یہ کہنا کہ اگر خلیفۃ المسلمین' امت کے تمام افراد کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کی ضرورت کو از خود پورا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خلافت کو چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیئے کیونکہ وہ اس کا اہل نہیں' اس زمانے کے لئے کس قدر ناقابلِ تصور تھا۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ میں گیہوں کی روٹی اس وقت کھاؤں گا جب مجھے یقین ہو جائیگا کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے' ورنہ میں جو کی روٹی ہی کھاؤں گا' اس زمانے کے آسمان کی آنکھ کے لئے کیسا تحیر انگیز تھا۔ سوچو سلیم! کہ اس زمانے میں اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں اس قسم کے فیصلے بہ تکلف نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کا عام معمول بن کر از خود سامنے آتے جائیں' کس قدر قبل از وقت تھا؟ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' ذہنِ انسانی تو تیرہ صدیاں آگے بڑھنے پر بھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ وہ ان تصورات کو اپنا کر زندگی کا معمول بنا لے۔ لہٰذا اس زمانے میں اس قسم کا نقشہ پیدا کر دینا' خواہ وہ قلیل ترین مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہو' کتنی بڑی کامیابی تھی۔

اس قلیل سی مدت کے بعد جو کچھ ہوا' اس کا تعلق زیادہ تر تاریخ سے ہے (اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے تمہارے سوال کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ نظام اس مقام سے آگے کیوں نہ بڑھا) تاریخ (بالخصوص عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ کی تاریخ) کے متعلق میرا نظریہ اور تصور تم پر واضح ہے۔ رسول اللہؐ خود قرآن پر عمل کرتے اور جماعتِ صحابہؓ سے اس پر عمل کراتے تھے۔ لہٰذا اگر اس دور کے متعلق ہماری تاریخ میں کوئی بات ایسی نظر آئے جو قرآن کے خلاف ہو تو ہم کہہ دیں گے کہ وہ بات صحیح طور پر تاریخ میں نہیں آئی۔

اس کے بعد جو دور آیا اس میں یہ نظام ایک ایسے حادثہ سے دوچار ہوا جس نے اسکی

گاڑی کو کسی اور ہی پٹری پر ڈال دیا۔ یہی وہ حادثہ ہے جسے پوری طرح سامنے آنے سے تمہارے سوال کا جواب مل جائیگا۔ یہ حادثہ تھا عجمی ممالک (ایران، عراق وغیرہ) کا مجموعی طور پر مسلمان ہو جانا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ اسلام کے انقلاب آفرین نظام کو سمجھ سوچ کر مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انھیں میدان جنگ میں شکست ہوئی اور وہ اسلام لے آئے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے اسلام لانے والوں کا ذہن قرآن کے انقلابی تصوراتِ زندگی کو بمشکل اپنا سکتا تھا۔ یہ لوگ اپنے ذہن میں ان تمام غلط تصورات نظریات اور معتقدات کو لئے ہوئے آئے جنھیں مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ ان کا خمیر بدترین قسم کی ملوکیت۔ نسل پرستی، پیشوائیت اور سرمایہ داری کا مرکب تھا اور اس پر صدیاں گذر چکی تھیں۔ پھر یہ لوگ اپنی شکست کے انتقام کے جذبات ساتھ لیکر بھی آئے تھے اس پر ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے مختلف شہروں اور قریوں میں ٹڈی دل کی طرح چھا گئے اور تھوڑے سے عرصہ میں ساری فضا کو اپنے خیالات کے مہلک جراثیم سے بھر دیا۔

تم جانتے ہو سلیم! کہ مجھے مسلمانوں کے کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف مسلمان ہوں اس لئے زیرِ نظر معاملہ میں مجھے نہ سنیوں کی تائید مقصود ہے نہ شیعہ حضرات کی مخالفت۔ انکے عقائد انھیں مبارک۔ میں تو ہر معاملہ کو خالص قرآن کی روشنی میں دیکھتا اور پرکھتا ہوں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان عجمی نو مسلموں نے محبتِ آلِ محمدؐ کے نازک جذبہ کی آڑ میں نسل پرستی کے تصور کو مقدس بنا کر آگے بڑھایا اور یہ عقیدہ پھیلایا کہ مسلمانوں کا امیر انتخاب اور مشاورت سے نہیں بن سکتا۔ یہ منصب خدا کی طرف سے آلِ محمدؐ کو ودیعت کیا گیا ہے اس لئے یہ حضرت علیؓ اور ان کے بعد ان کی اولاد میں وراثۃً باقی رہیگا۔ اس ایک عقیدہ میں ملوکیت، نسل پرستی اور پیشوائیت تینوں کے اثرات یکجا جمع ہو گئے یعنی یہ کہ امارت ایک خاندان کے اندر محدود رہیگی باپ سے بیٹے کو ورثہ ملے گی اور خدا کی سندِ تقدس کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ یہ تصورات فتح ایران کے تھوڑے عرصہ (حضرت عمرؓ کی وفات) کے بعد پھیلنے شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتے گئے۔ بنی امیہ کے زمانے میں (اگرچہ ملوکیت قائم ہو چکی تھی لیکن پھر بھی) ان کی رفتار دھیمی سی رہی۔ بد قسمتی سے بنو عباس نے اپنی سلطنت ہی ان عجمیوں کی مدد سے حاصل کی تھی اس لئے ان کی سیاست کا تقاضا تھا کہ عربی اقتدار کو یکسر کچل دیا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے زمانہ میں یہ خیالات اس تیزی کے ساتھ پھیلے کہ دین کا کوئی گوشہ ان سے غیر متاثر نہ رہ سکا۔ غیر متاثر ہی نہیں بلکہ دین کے ایک ایک عنصر کی جگہ انہی تصورات نے لے لی اور یوں قرآن کا لایا ہوا پیغامِ انقلاب یکسر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا (میں نے اس مقام پر عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے لائے ہوئے خیالات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ الگ داستان ہے) ان خیالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں کس قدر تبدیلی آگئی۔ اس کا اندازہ دو ایک مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں احادیث منسوب الی الرسول کے مجموعے تیار ہو رہے تھے۔ امام بخاریؒ سنیوں کے امام ہیں اور ان کا مجموعہ حدیث اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کیا جاتا ہے یعنی قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب۔ اس کتاب میں یہ واقعہ درج ملتا ہے۔ کہ جب حضرت ابابکر صدیقؓ کا انتخاب ہوا ہے تو حضرت علیؓ نے آپ کی بیعت نہیں کی اور چھ ماہ تک اس سے الگ رہے۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعتِ خلافت کر لی اور ان سے یہ کہا کہ

> آپ کو خدا نے جو رتبہ دیا ہے ہم کو اس پر حسد نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کو اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں کیونکہ رسول اللہ کے ساتھ قرابت کی وجہ سے ہم اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ (بخاری۔ باب غزوۂ خیبر)

تم نے دیکھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ یعنی اس میں کہا یہ گیا ہے کہ حضرت علیؓ خلافت کو وراثت سمجھتے تھے جسے رسول اللہؐ کے بعد آپ کے رشتہ داروں کی طرف منتقل ہونا چاہئے تھا۔ میں تو یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت علیؓ اسلام کے اس بنیادی نقطہ کو بھی نہیں سمجھتے تھے کہ خلافت ملوکیت کی طرح رشتہ داروں میں ورثۃً نہیں آتی بلکہ خلیفہ، امت کے مشورہ اور رضامندی سے منتخب ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تصور کے ماتحت میرے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں۔ لیکن یہ تو بہر حال واقعہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اسے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کیا اور اس زمانے کے مسلمانوں نے بھی اسے صحیح ہی سمجھا جو اسے اس مجموعہ میں شامل ہونے دیا اور نہ صرف شامل ہونے دیا بلکہ اس مجموعہ کو اصح الکتب بھی قرار دیا۔ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے قریب چھ لاکھ حدیثیں جمع کیں جن میں سے مکررات چھوڑ کر قریب دو ہزار ایسی تھیں جنھیں انھوں نے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ انہی میں یہ روایت بھی ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے وہ یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری میں خود مسلمانوں کی ذہنیت اس سطح پر آگئی تھی کہ انھوں نے اس بات کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ یعنی اسوقت وہ ذہنیت جسے رسول اللہؐ نے تعلیم قرآن سے پیدا کیا تھا، ختم ہو چکی تھی اور وہ ذہنیت جو اس زمانے میں عام تھی (یعنی بادشاہت، ورثۃً ملا کرتی ہے)۔ مسلمانوں میں بھی آچکی تھی۔ ان میں عملاً ملوکیت رائج تھی اور اس میں وہ کوئی خرابی محسوس نہیں کرتے تھے۔ جبھی تو انھوں نے اسے حضرت علیؓ کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ ورنہ اگر ذہنیت وہی ہوتی جسے رسول اللہؐ نے پیدا کیا تھا تو نہ امام بخاریؒ اس روایت کو صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں شامل کرتے اور نہ ہی دوسرے مسلمان اسے حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیتے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ بلند ذہنیت جسے رسول اللہؐ نے انقلابی طریق سے (BY REVOLUTION) پیدا کیا تھا کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو گئی تھی اور مسلمان اپنے دور کی عام سطح تک آگئے تھے۔ اور اس کی وجہ سے ان غیر قرآنی تصورات کا سیلاب تھا جو ایران و عراق کی طرف سے یک لخت امنڈ کر آگیا تھا۔

یا مثلاً وہ واقعہ جو ہمیں امام داؤدؒ کے مجموعہ احادیث میں ملتا ہے۔ تم پر اب تک یہ حقیقت واضح ہو چکی ہوگی کہ قرآن، سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سرمایہ داری کی اصل بنیاد وہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہوتی ہے جو انسان کی ضروریات سے زائد ہو۔ اور وہ اسے جمع کرے۔ قرآن نے دولت جمع کرنے کو جرم عظیم قرار دیدیا اور اس طرح فاضلہ دولت کا وجود ختم کر دیا۔ اس باب میں قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اہم آیت سورۂ توبہ کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ..... مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹/۳۴)۔ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، تو انھیں الم انگیز عذاب کی خبر دیدے۔ جب اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشت پر داغ دیا جائیگا۔ اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا جو کچھ تم اس طرح خزانہ بنا کر بیٹھ گئے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔ بات بالکل صاف ہے سلیم! قرآن نے دولت جمع کرنے کو جرم قرار دیا۔ رسول اللہؐ نے اس پر عمل کر کے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں فاضلہ دولت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (اس عبوری دور کے لئے جس میں ہنوز یہ نظام متشکل نہیں ہوا تھا، خیرات، وراثت وغیرہ کے احکام دیئے گئے تھے) یہ وہ نظام تھا جو اس زمانے کی عام ذہنیت کے لئے یکسر غیر مانوس تھا۔ اسے مانوس بنانے کے لئے حضورؐ نے اپنی تعلیم سے صحابہؓ میں وہ بلند ذہنیت پیدا کی تھی جو اس انقلابی نظام کی متحمل ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد (ان اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) مسلمان پھر اسی سطح پر اتر آئے جو اس زمانے عام تھی۔ چنانچہ ابو داؤد میں سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

> ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ۔ تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انھوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ۔ یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے ..... ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ بیان سنکر حضرت عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا (ابو داؤد بحوالہ مشکوٰۃ۔ جلد اول۔ کتاب الزکوٰۃ)

تم غور کرو سلیم! کہ یہ ذہنیت (کہ صحابہؓ پر خدا کا حکم گراں گذرے۔ حضرت عمرؓ اس مصیبت کا حل تلاش کرنے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس جائیں۔ اور رسول اللہؐ یہ فرما کر اس مشکل کا حل بتا دیں کہ جتنی جی چاہے دولت جمع کرو۔ بس اس میں سے سال کے بعد اڑھائی فیصدی خدا کے نام پر دیدیا کرو۔ باقی سب جائز ہو جائیگا) کبھی بھی وہ ذہنیت ہو سکتی ہے جسے رسول اللہؐ نے انقلابی طور پر صحابہؓ میں پیدا کر دیا تھا اور جس کی رو سے (اور تو اور) انہی حضرت عمرؓ کی۔ جن کے متعلق اوپر کی روایت میں کہا گیا ہے کہ وہ اس مصیبت کا حل معلوم کرنے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس گئے تھے) یہ حالت تھی کہ

> بہ حیثیت امیر المؤمنین آپ کے گذارہ کے لئے جو وظیفہ مقرر کیا گیا تھا اس کی تعداد

دو درہم روزانہ تھی (ابن سعد)

اور

حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے شمار کیا کہ تہ بند میں بارہ پیوند تھے۔ (کنز العمال)

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں امام ابو داؤد نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہے اسوقت مسلمان دنیا کے عام دستور کے مطابق اسی سطح پر اتر آئے تھے کہ اگر کچھ خیر خیرات کر دی جائے تو سرمایہ داری کے نظام میں کوئی عیب نہیں۔ جبھی تو امام داؤد نے اس قسم کی روایت کو صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا (جو قرآن کا بنایا ہوا سارا نظام درہم برہم کر دیتی ہے) اور مسلمانوں نے اسے صحیح تسلیم کر لیا۔

میرا خیال ہے سلیم! ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ

(۱) قرآن نے زندگی کے متعلق ایسے تصورات دیئے تھے جو اس زمانے کی عام سطح کہ بہت بلند تھے اور اس اعتبار سے بہت قبل از وقت تھے۔

(۲) رسول اللہ نے اپنی محیر العقول تعلیم و تربیت سے اپنے رفقائے محترم کی ذہنیت میں ایسی بلندی پیدا کر دی کہ وہ قرآن کے ان انقلابی تصورات کو اپنانے کے قابل ہو گئے (یہ ایک جداگانہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی تبدیلی قبول کر لینے والے افراد بھی اسی قوم میں مل سکتے تھے جو قرآن کی اوّلین مخاطب تھی)

(۳) جب مسلمانوں کی فتوحات عام ہوئیں تو وہ لوگ سیلاب کی طرح امنڈ کر اسلام میں داخل ہو گئے جن کی ذہنیت اس دور کی عام ذہنیت کی سطح پر تھی اور ان کی تعلیم و تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی جس سے ان کی سطح میں بھی وہ بلندی آجاتی جس سے وہ قرآنی تصورات کو اپنانے کے قابل ہو جاتے۔

(۴) اس طرح مسلمانوں کی قوم (اسلام نہیں بلکہ مسلمانوں کی قوم) اس سطح پر آگئی جو اس زمانے کی عام سطح تھی۔ اور انھوں نے اسلام کو اسی ذہنیت کے قالب میں ڈھال دیا۔ یہ چیز قرآن کی اس تفسیر کی رو سے بہت آسان تھی جو وضعی روایات کے ذریعے عام کی گئی۔

(۵) یوں اسلام تھوڑے عرصے کے بعد آگے نہ چلا۔ اگر وہ لوگ دین کا مدار قرآن کو قرار دیتے اور عہد نبی اکرمؐ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ کو قرآن کی روشنی میں پرکھتے تو وہ ان عجمی خیالات سے متاثر نہ ہوتے اور اس طرح صحیح اسلام آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ممکن ہے تم یہ کہدو سلیم! کہ قرآن نے ایسے تصورات دیئے ہی کیوں جو اس زمانے کی سطح سے اتنے آگے تھے؟ (مجھے تمہارے متعلق تو یہ توقع نہیں کہ تم ایسی سطحی بات کہدو۔ لیکن جن لوگوں سے تمہیں واسطہ پڑتا ہے وہ ضرور ایسا کہدینگے۔ لہٰذا انھیں سمجھانے کے لئے لکھتا ہوں کہ) انقلابی تصور تو کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے زمانہ کی ذہنیت کا پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اس سے بہت آگے اور بہت بلند ہو۔ اگر وہ اپنے زمانے کی سطح سے آگے نہیں تو اسے انقلابی کیسے کہا جا سکیگا؟ لہٰذا کوئی تصور جتنا زیادہ انقلابی ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اپنے زمانے سے آگے، فلہٰذا قبل از وقت ہوگا۔ قرآن چونکہ یکسر انقلابی تصورات کا حامل ہے، اس لئے وہ اپنے زمانہ نزول کی سطح سے کہیں آگے تھا۔ "اپنے زمانۂ نزول" تو ایک طرف، وہ تو ہمارے زمانے کی سطح سے بھی کہیں آگے ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس قسم کے انقلابی تصورات دیئے کیوں جاتے ہیں جو اپنے دور سے آگے ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ زمانے کی امامت کریں۔ وہ انسانی ذہنیت کو اپنے پیچھے لگائیں اور اسے بتدریج اس منزل تک لے جائیں جس تک وہ تصورات کاروانِ انسانیت کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر انقلابی تصورات دنیا میں نہ آئیں تو انسانی ذہنیت اپنی سطح سے ایک انچ بھی اونچی نہ ہو سکے۔ یہ انہی تصورات کی راہ نمائی ہے جو انسانی ذہن کے لئے چراغ راہ بنکر اسے بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ تصورات، فضا میں ایسے "جراثیم" چھوڑ دیتے ہیں جن سے انسانی ذہن، غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح غیر محسوس طور پر ان کے پیچھے چلتا رہتا ہے اسی کو لوگ عام طور پر "زمانے کا تقاضا" کہتے ہیں۔ "زمانے کا تقاضا" سلیم! ایک مبہم اصطلاح ہے۔ جن لوگوں کے سامنے وحی کے انقلابی تصورات نہیں ہوتے وہ سمجھ نہیں سکتے کہ انسانی ذہن کونسی کشش سے کھنچے کھنچے ایک خاص سمت کو جا رہا ہے۔ یہ کشش درحقیقت وحی کے انقلاب آفریں (قبل از وقت آئے ہوئے) تصورات کی غیر محسوس راہ نمائی ہوتی ہے۔ جو فضا میں پھیلی ہوتی ہے اور جس سے انسانی ذہن غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے تم تاریخ کا مطالعہ کرو سلیم! تو تمہیں اس سوال کا جواب مل جائیگا کہ کیا قرآن کے دیئے ہوئے تصورات چند ہی دن تک چلکر رہ گئے یا وہ آج تک برابر چلتے آ رہے ہیں اور زمانہ برابر "مسلمان ہوتا" چلا جا رہا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں قرآن نے اپنے انقلاب آفریں تصورات دیئے تھے، اس وقت انسانی ذہنیت کس سطح پر تھی۔ پھر اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں انسانی ذہن نے ان تصورات کو قبول کیا ہے جو قرآن نے دیئے تھے، یا وہ ان تصورات سے ہٹ کر ان سے متضاد سمت کی طرف گیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، انسانی ذہن کا اسوقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق نظامِ جہانبانی ہے۔ قرآن نے اسکی تردید کی اور یہ تصور دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اسوقت ذہنِ انسانی کے لئے یہ تصور نامانوس تھا۔ تم بتاؤ کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال میں، ذہنِ انسانی کا رخ ملوکیت کی سمت رہا ہے یا وہ "آہستہ آہستہ" اسلام قبول کرتا چلا گیا ہے۔ اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

انسانی ذہن کا اسوقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزو لاینفک اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ ہے اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلافِ انسانیت ہے۔ اس وقت کے ذہنِ انسانی کی عام سطح نے اس تصور کو ناقابلِ قبول سمجھا۔ لیکن بتاؤ کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصور کو قابلِ قبول سمجھا یا اپنے قدیمی تصور کو؟

ذہنِ انسانی کا اس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر یعنی ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہرِ ذاتی سے ہے نہ کہ انتساباتِ نسبی سے۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا۔ لیکن تم غور کرو کہ اس کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا؟

اس زمانہ میں ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں اسلئے ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تصور ذہنِ انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر مرتب ہونگی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا اس لئے رد کر دیا۔ لیکن تم بتاؤ کہ آج تمہارے زمانہ کا رخ کیا اس رد کردہ تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

اس زمانہ میں جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابقِ فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ ہر فردِ انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشو و نما ہے۔ اسلئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اُس زمانہ نے اس تصور کو ٹھکرا دیا لیکن ذرا غور کرو سلیم! کیا زمانہ اسی ٹھکرائے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب و بیچین نہیں ہے؟

میں نے یہ چند باتیں محض بطورِ مثال لکھدی ہیں۔ ورنہ قرآن کی کونسی حقیقت ہے جو اس اصول کی تائید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ زمانہ اسکے انقلاب آفریں حقائق میں سے بعض کو اپنا چکا ہے، بعض کو اپنانے کے لئے مضطرب و بیقرار ہے اور جو باقی حقائق ہیں وہ ابھی اس زمانہ کی سطح کیلئے بھی قبل از وقت ہیں۔ یہ اسلئے کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے آخری اور مکمل رہنمائی ہے۔ لہٰذا اس کے حقائق زمانے کی ابھرن کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم نوعِ انسانی کو اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے۔

لیکن اس بوالعجبی کو کیا کہئے سلیم! کہ دنیا جوں "انفس و آفاق" کی شہادت سے حقیقت

کو پہنچانے کا راستہ اختیار کرتی ہے وہ تو قرآنی حقائق سے مانوس ہوتی چلی جا رہی ہے، لیکن مسلمان کے سامنے جب قرآن خالص کی تعلیم آتی ہے تو وہ اسکی سخت مخالفت کرتا ہے اس لئے کہ اس نے اپنی ذہنیت وہی رکھی ہے جو ہزار سال پہلے عجمی تصورات کی بدولت بنی تھی اور اس کا نام "اتباع سلف" رکھکر اس سے متمسک رہنے ہی میں نجات و سعادت کا راز سمجھتا ہے۔ اگر وہ قرآن پر غور و فکر کے بعد اپنی روش متعین کرے اور اسلاف کے ترکہ میں جو کچھ ملا ہے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھکر، جو اس کسوٹی پر کھرا ثابت ہو اسے قبول کرے اور جو کھوٹا ثابت ہو اسے چھوڑ دے، تو اسے پھر سے وہی راستہ مل جائے گا جس پر نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ گامزن ہوئے تھے اور یہ اپنے زمانہ کی عام سطح سے کہیں اونچا چلا جائے گا۔ لیکن یہ ایک الگ مبحث ہے۔

اب بتاؤ سلیم کیا اس کے بعد بھی تم یہی کہوگے کہ اسلام صرف چند دنوں تک چل سکا اور اسکے بعد فیل ہوگیا؟ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ زمانہ میں آگے صرف اسلام ہی چلا، غیر قرآنی تصورات سب ایک ایک کر کے فیل ہو گئے۔

وان الباطل کان زھوقا۔

والسلام

۸ر جون ۱۹۵۵ء　　پرویز

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزم ہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیز ڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد بمعہ گردپوش ——— قیمت۔ بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۰ صفحات ——— قیمت ——— آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت ——— چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت ——— چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۷۵ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات۔ قیمت ——— چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۷ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظام ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔
قیمت قسم اول ——— چھ روپے　قسم دوم ——— (غیر مجلد) ——— چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ ——— قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گردپوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳ - کراچی

حقائق و عبر

پتی پوجا

محترم دریابادی صاحب کے اخبار صدق (لکھنؤ) بابت ۲۷؍ ۵؍ ۵۵ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:

آج چار دن کے بعد پتی پوجا کی تقریب عظیم ختم ہوئی۔ یہ تقریب دریائے گومتی کے کنارے یونیورسٹی کے متصل شوہر دار ہندو عورتوں نے اوندھے منہ لیٹے شوہروں کے قدموں گر گر کر ان کی پوجا کی۔ پوجا کے لیڈر ضلع رائے بریلی کے ایک سادھو شری امیش جی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں سو بیویوں نے حصہ لیا۔ وسیع شامیانہ اور خیمے الگ الگ لگے ہوئے تھے۔ پہلے میاں بیوی مل کر پاربتی دیوی کی پوجا کرتی تھیں۔ پھر ہر خیمہ میں جاکر بیویوں نے شوہروں کے پاؤں دھوئے اور وہ دھوون پیا۔ اس کے بعد انھوں نے شوہروں پر پھول چڑھائے۔ اور ان کے پیروں کو چھوا۔ ایک پنڈت جی نے مائیکروفون پر منتر پڑھا۔ جس میں بیوی شوہر سے کہتی ہے کہ تم ہی میرے پالن ہار ہو۔ تم ہی میرے پیدا کرنے والے ہو۔ اور تم ہی میرے ختم کرنے والے ہو۔ پنڈال میں کسی بن بیاہے یا بن بیاہی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ہندوؤں کی ایک قدیم مذہبی تقریب ہے۔ جس کی تجدید اب ہو رہی ہے کہا جاتا ہے کہ سری کرشن جی کی طرف سے پتی ورت دھرم پیش ہونے کے بعد دوارکا میں بیویوں نے اپنے شوہروں کی پوجا اس طرح کی تھی۔ ۵ من تیل اور گھی اور گڑ اور صندل پانچ ہون کنڈوں میں صرف ہوتا رہا۔"

اس خبر پر مولانا دریابادی صاحب کا تبصرہ بھی ساتھ ہی شائع ہوا ہے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ انھوں نے لکھا ہوگا کہ انسان انسان کی پوجا کرے (خواہ وہ خاوند ہی کیوں نہ ہو) ہندومت ہی کو زیب دے سکتا ہے جو انسان کے عہد توہم پرستی کی یادگار ہے۔ اسلام میاں اور بیوی کا احترام سکھاتا ہے۔ پوجا کرنا نہیں سکھاتا۔ وغیرہ۔

لیکن نہیں! تبصرہ کچھ اور ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہے:

شاباش ہے اودھ کی دھرم پتنیوں کی اس جرأت و ہمت کو۔ اس بیسویں صدی میں "حریت نسواں" کے عین غلغلہ کے وقت یہ پتی پوجا کر ڈالی۔ کہیں کسی جنگل یا دیہات میں چھپ چھپا کر نہیں عین شہر لکھنؤ میں بجلی کے تیز قمقموں کی چمک دمک میں۔ لاؤڈ اسپیکروں پر ہانک پکار کے ساتھ اور وہ بھی یونیورسٹی کے عین متصل! اور آخری دن فوٹو ہی نہیں لئے گئے، بلکہ کسی منچلی امریکی کمپنی نے فلم بھی تیار کر لی! ——— کیا کہئے ہمارے ملک میں نہ ہوئی کوئی "اپوا" کی قسم کی ترقی پسند زنانہ انجمن۔ ورنہ ان دھرم پتنیوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس صدی میں پتی پوجا کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

آپ نے غور فرمایا ان مولانا صاحب کی طرف سے اس قسم کے کھلے ہوئے شرک پر شاباش کیوں مل رہی ہے؟ اس لئے کہ (شرک ہی سہی) اس سے معاشرہ میں عورت کی حیثیت مرد کے مقابلہ میں ایک لونڈی سے بدتر رہ جاتی ہے (بدتر اس لئے کہ اس مکروہ حرکت کو تو شاید کوئی لونڈی بھی گوارا نہ کرے کہ وہ آقا کے غلیظ پاؤں دھوکر دھوون غٹاغٹ پی جائے) اور مولوی ایسی باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک عورت کا مرد کے برابر واجب التکریم قرار پا جانا انتہائی درجہ کا خلاف انسانیت تصور ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب اپنے اسی پرچہ میں دوسری جگہ لکھ رہے ہیں کہ "طبقہ خواتین کی طرف سے مطالبۂ حقوق کا شور اس ہمہمہ کے ساتھ بلند ہوا اور آزادی نسواں کا بگل اس زور کے ساتھ بجایا گیا کہ پڑھی لکھی خاتون ہر قید ہر پابندی، ہر خدمت و اطاعت کو اپنے حق میں غلامی اور اپنی خودداری کے منافی سمجھ بیٹھی"۔

آپ کو معلوم ہے کہ عورتوں کے مطالبۂ حقوق پر اس طرح نعل بر آتش ہو جانے والے اور خاوندوں کے پاؤں دھوکر پی جانے والی بیویوں پر شردھا کے پھول نچھاور کرنے والے یہ مولوی صاحب جیسے قرآن کے مفسر بھی ہیں۔ اسی قرآن کے جس میں (معاذ اللہ، بدقسمتی سے) یہ بھی لکھا ہے کہ

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲۲۸)

قاعدے کے مطابق عورتوں کے مردوں پر اتنے ہی حقوق ہیں جتنے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں۔

قرآن کی اس قسم کی آیات کو دیکھ کر یقیناً ان لوگوں کا خون کھول جاتا ہوگا کہ اس میں یہ کیوں درج ہیں۔ اگرچہ عملاً انھوں نے آیات کو روایات اور فقہ کی رو سے مدت ہوئی منسوخ کر رکھا ہے۔

تخت کے خواب

دلی کے شاہزادوں کی حالت یہ تھی کہ سلطنت چھنی کو سو سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور ان کا گذارہ اب تانگے چلانے اور مٹھائی بیچنے پر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو "ابد دولت" کہا کرتے تھے۔ اور لال قلعہ میں جشن تاجپوشی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ شاہزادے تو دلی ہی میں رہ گئے۔ لیکن ان کی جگہ یہاں نئی قسم کے شاہزادے پیدا ہو گئے۔ یہ وہ شاہزادے ہیں جنہیں کسی وقت مشتری کی نیک گردش سے وزارت کی کرسی مل گئی۔ اور پھر زحل کی نحوست سے وہ اس سے برطرف کر دیئے گئے۔ لیکن وہ اس کے بعد عمر بھر اسی کرسی کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ انہی شاہزادوں میں ایک بزرگوار سندھ کے قاضی فضل اللہ صاحب ہیں۔ یہ کسی زمانہ میں سندھ کے ہوم منسٹر تھے۔ مدت ہوئی وہ منصب ان سے چھن گیا لیکن پچھلے دنوں جب فیڈرل کورٹ نے یہ کہا کہ ۱۹۴۷ء سے اس وقت تک کے مجلس آئین ساز کے پاس کردہ قوانین قانونی حیثیت نہیں رکھتے تو قاضی صاحب نے جھٹ سے حکم صادر فرما دیا کو سندھ کے ہوم منسٹر ہم ہیں۔ اس لئے تمام فائلیں ہمارے پاس بھیجی جایا کریں۔ اس حکم پر قہقہوں کی آواز ہنوز فضا میں گونج ہی رہی تھی کہ انھوں نے اب فرما دیا کہ صوبہ سندھ کی مسلم لیگ کے صدر وہ ہیں نہ کہ کھوڑو صاحب۔ چنانچہ وہ بہ حیثیت صدر پارلیمانی بورڈ کا جلسہ بھی طلب کر رہے ہیں تاکہ مجلس آئین ساز کی نشستوں کے لئے امیدواروں کو ٹکٹ تقسیم کئے جائیں۔ غور کیجئے کہ

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر

لیکن یہ ابھی تک اپنے اسی گہوارۂ طفلی میں جنتوں کے حسین خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ چیز ایک قاضی فضل اللہ صاحب تک ہی محدود نہیں تمام "پاکستانی شہزادوں" کا یہی حال ہے۔ جو ایک دفعہ وزارت کا جھولا جھول لیتا ہے۔ پھر باقی عمر اسی کی پینگ میں گذار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان حضرات کے ذاتی جوہر تو کچھ ہوتے نہیں کہ وہ کہیں اور کسی حال میں بھی رہیں ان کی شہرت اور مقبولیت ان کے ساتھ رہے۔ ان غباروں کی بلندیوں کا راز اس گیس میں ہوتا ہے۔ جو ان میں وزارت کا پمپ بھر دیتا ہے۔ جونہی وہ گیس نکلا غبارہ زمین پر آ لیا اور اس کے بعد ——— پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
یہ وجہ ہے کہ ان کی باقی تمام عمر اسی پمپ کی ہوس میں گذر جاتی ہے۔ ان سے کون کہے کہ

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو

ذاتی ملکیت
کا اصول
مُلّا کے نزدیک بڑا مقدس ہے
لیکن
اس کے بارے میں
قرآن کا حکم کیا ہے؟
اس کی تفصیل
"نظام ربوبیت"
میں دیکھئے

بین الاقوامی جائزہ

روس نے "امن" کے ترکش سے ایک اور تیر چلایا ہے اب کے اس کا نشانہ مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ایڈی نار ہیں انھیں ماسکو آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جو قبول کرلی گئی ہے۔ اس دعوت کا مقصد سفارتی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی استواری ہے۔ روس کا یہ اقدام قطعاً حیران کن نہیں کیونکہ ایک عرصہ سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ ایسا کریگا البتہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس سے کیا فائدہ اٹھاتا ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ایڈی نار کا تعلق ہے انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ گٹھ بندی اور مغربی اتحاد کے حق میں ہیں اور اس سے دست کش نہیں ہونا چاہتے۔ اگر وہ اسی پالیسی پر کاربند رہے تو روس کو ان سے کسی بہتری کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ لیکن روس ڈاکٹر موصوف کو پھانسنے سے کہیں زیادہ اسے ضروری سمجھتا ہے کہ اپنی امن پسندی کا ثبوت دے کر اندرون ملک ان کی پوزیشن مخدوش کردے تاکہ وہ زیادہ سرگرمی سے مغرب کے اتحادی نہ بن سکیں۔ مغربی جرمنی نے اس دعوت کا خیر مقدم کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ اعلان کیا ہے کہ اقوام مغرب سے مشورہ کئے بغیر روس سے مذاکرات کا آغاز نہیں کیا جائیگا۔ چنانچہ ڈاکٹر ایڈی نار ۱۸ جون کو نیویارک میں امریکی، برطانوی اور فرانسیسی وزرائے خارجہ سے مل رہے ہیں۔ وہ اس طرح صلاح مشورہ کرنے کے بعد ماسکو جائیں گے۔

روسی وزیر خارجہ مسٹر مالوٹوف نے فرانسیسی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کو بھی ماسکو آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ سان فرانسسکو جاتے ہوئے پیرس میں ان حضرات سے ملے اور دوران گفتگو میں یہ معنی خیز فقرہ استعمال کیا کہ جو ہو چکا ہے اسے جانے دیجئے۔ یہ اس فرانس کو کہا جارہا تھا جسے کئی بار دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے معاہدات پیرس کی توثیق کردی تو اس سے معاہدہ دوستی منقطع کردیا جائیگا۔ چنانچہ بعد میں یہ معاہدہ منسوخ کردیا گیا تھا۔ روس نے یہ پینترا اس لئے بدلا ہے کہ اب دھمکیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اب وہ ایک ایک ملک کو علیحدہ علیحدہ مل کر اپنی امن پسندی اور دوستی کا یقین دلا رہا ہے اور غیر جانبداری کے حق میں فضا سازگار کر رہا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ اس کے امن کا نشانہ ترکی بھی بن جائے۔ یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو پر ڈورے ڈالنے کے بعد روسی قائدین کی نظریں یونان اور ترکی پر پڑ رہی ہیں۔ ترکی اور یونان ناٹو کے ارکان ہیں اور ترکی، یونان اور یوگوسلاویہ بلقانی معاہدے میں شریک ہیں۔ روس ہر دو معاہدات کو معطل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

اس سلسلہ کی اہم کڑی پنڈت نہرو کا سفر ماسکو ہے۔ پنڈت نہرو کو یوں تو روس نے ایک عرصے سے مدعو کر رکھا تھا لیکن وہ ایسے وقت ماسکو پہنچے ہیں جبکہ روس کی پالیسی میں قابل ذکر تبدیلی آچکی ہے اور اس کے قائدین برسوں سے راندۂ درگاہ مارشل ٹیٹو کے پاس جانے میں کچھ عار محسوس نہیں کرتے

اگر وہ بلگریڈ جانے کی زحمت اور ایک حد تک ذلت گوارا کرسکتے ہیں تو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی آؤ بھگت کرنے میں انھیں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں روایتی بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک دعوت میں تو وزیر اعظم روس مارشل بلگانن نے یہاں تک کہدیا کہ ہندوستان ایشیا کی تین بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے اور یہ طاقتیں (یعنی روس، چین اور ہندوستان) دفاعی تنظیم میں منسلک ہوسکتی ہیں۔ (اس اعلان کے مضمرات پر لمعات میں روشنی ڈالی گئی ہے)

بین الاقوامی توجہات کا مرکز سان فرانسسکو بنتا جا رہا ہے جہاں ۲۰ سے ۲۶ جون تک اقوام متحدہ کی دسویں سالگرہ کی تقریب منائی جارہی ہے۔ چونکہ اس موقع پر اقوام متحدہ کے ۶۰ ارکان کے وزرائے خارجہ موجود ہوں گے، اس لئے اہم [illegible] اور تبادلۂ خیالات کا موقع ہوگا۔ اس کا فوری نتیجہ تو شاید کچھ نہ نکلے لیکن اس سے دول عظمیٰ کی وہ کانفرنسیں ضرور متاثر ہوں گی جو اس تقریب کے بعد منعقد ہو رہی ہیں۔

بزم طلوع اسلام

مردان

بزم طلوع اسلام مردان کا ذکر ان کالموں میں ایک سے زیادہ مرتبہ آچکا ہے۔ یہ بزم بڑی فعال جماعت ہے اور اس نے اپنی سرگرمیوں کو کافی وسیع کرلیا ہے۔ ذیل میں عبدالحکیم صاحب ترجمان بزم کی ارسال کردہ روئداد کے کچھ اقتباسات دیئے جاتے ہیں جن سے انکی مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا۔ ہمارا درس قرآن بدستور جاری ہے۔ ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک ڈاکٹر ٹی، ایم خان صاحب کے مکان پر درس قرآن ہو رہا ہے۔

ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ہماری مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل محلہ اور اہل مردان نے جگہ بہ جگہ مساجد میں یا اپنی اپنی قیام گاہوں میں درس قرآن شروع کردیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مردان میں قرآن کی آواز گونج اٹھی ہے اور امید ہے کہ اہل مردان اپنی دنیا اور آخرت کو خوشگوار بنا لیں گے۔ اگرچہ ان پاک محفلوں میں بعض وقت ہماری مخالفت بھی ہوتی ہے لیکن ہمیں

مخالفت کا اتنا افسوس نہیں جتنی خوشی درس قرآن کی ہو۔ ہم اس میں ہر ایک مسلمان بھائی کو دعوت دیتے ہیں کہ درس میں شمولیت کر کے قرآن کی آواز کو زیادہ سے زیادہ مسلمان بھائیوں تک پہنچائے۔

۱۰ر جون کو ہمارا ماہانہ اجتماع ڈاکٹر ٹی، ایم خان صاحب کے ہاں منعقد ہوا۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ ایجنڈے پر حسب ذیل کارروائی تھی۔ "طلوع اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ موجودہ غیر اسلامی و غیر قرآنی معاشرہ کو اسلامی اور قرآنی معاشرہ بنانے کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔ گذشتہ چھ سات برس سے طلوع اسلام یہی دعوت اہل فکر حضرات کو دیتا رہا ہے۔ ہم اور ان کے رفقا بھی اس پیغام کو مخاطب بنے اور اتنے لمبے عرصے تک اس پر غور و فکر کرتے رہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ غور و فکر سے آگے بڑھیں اور عملاً قرآنی معاشرہ کا سنگ بنیاد رکھیں عملاً قرآنی معاشرہ کی ابتدا کس طرح کی جائے؟ اس اجلاس میں اس پر غور و خوض ہوگا۔"

اجلاس میں اس پر غور و خوض کیا گیا مگر حتمی فیصلہ نہ ہو سکا مزید غور و خوض آئندہ مہینے کے اجلاس میں ہوگا؟

اسی اجلاس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ہر کیم تاریخ کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں بزم کا اجتماع ہوا کریگا۔ تمام رفقا کو بڑی سختی سے تاکید کی گئی کہ اس وقت سب کام کاج چھوڑ کر بزم میں شریک ہونے کے لئے حاضری دیا کریں۔

عہ موجودہ شدید مخالفت پر بحث کی گئی مگر یہی فیصلہ کیا گیا کہ مخالفت کے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مخالفت جتنی شدت سے ہوگی اسی مناسبت سے کامیابی اور کامرانی یقینی ہے۔ یہ بالاتفاق طے پایا کہ احسن طریق سے مخالفین کو سمجھانا ضروری ہے۔

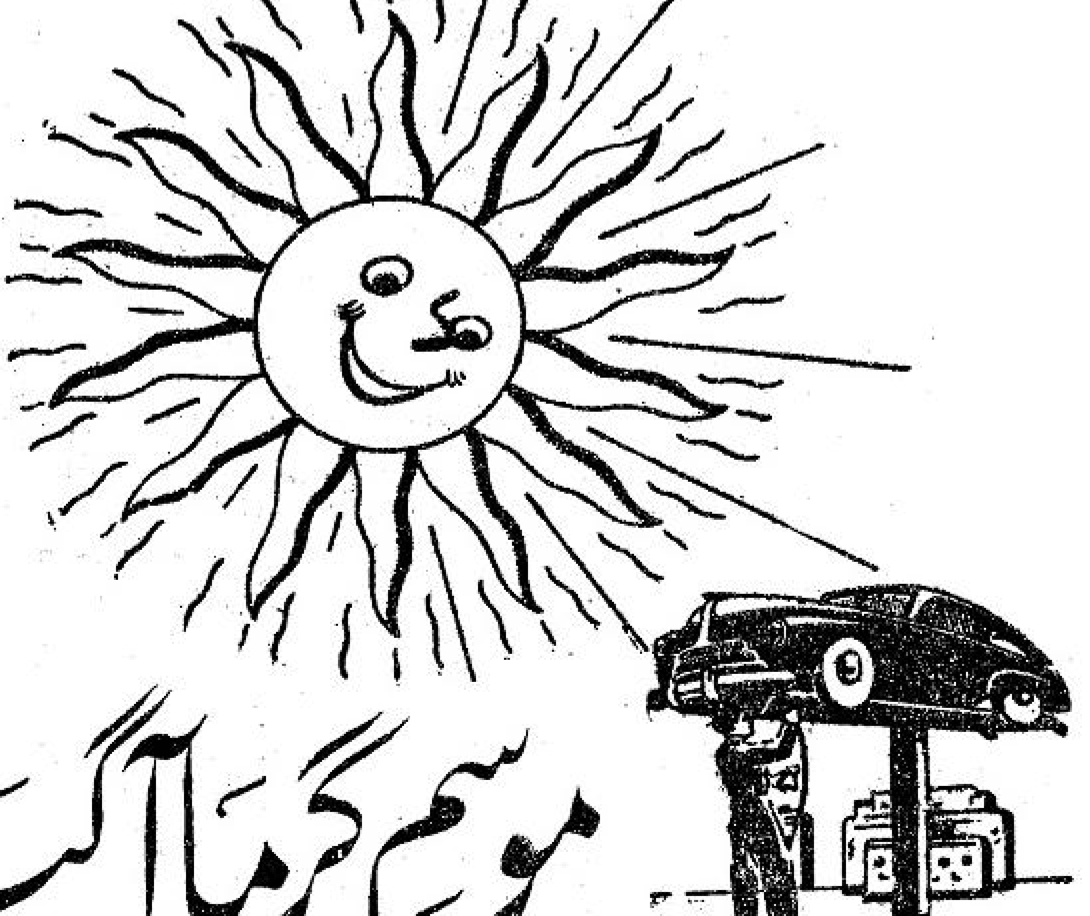

موسم گرما آگیا

یہی وقت ہے کہ مارفک لبری ٹیکشن کے ذریعہ آپ اپنی موٹر کو گرمی کے مضرت رساں اثرات، گرد اور ریت سے محفوظ رکھیں مارفک لبری ٹیکشن سروس پر باقاعدگی کے ساتھ عمل کرنے سے آپ کی موٹر کی زندگی میں خواہ وہ نئی ہو یا پرانی اضافہ ہوتا ہے گا۔ اور وہ بہتر طریقہ پر چلے گی۔ اس "سسٹم" کے مرتب کرنے اور ترقی دینے کی غرض یہ ہے کہ آپ کی موٹر کو مناسب وقفوں پر صحیح طریقہ پر کالٹکس لبری کنٹس سے چکناہٹ حاصل ہوتی رہے۔ لبری کنٹس اعلیٰ کارکردگی اور طویل عرصہ فراہم کرنے کے لئے خصوصی طور پر تیار کئے جاتے ہیں۔ جو اتفاقی طور پر نہیں بلکہ چارٹ کے ذریعہ تربیت یافتہ میکینکس استعمال کرتے ہیں (چارٹ سے مراد آپ کی موٹر کے لئے وہ خصوصی نقشہ یا خاکہ ہے۔ جس میں لبری کیشن کے پوائنٹس، گریس نیپلز وغیرہ دکھائے گئے ہیں۔ اور موزوں کالٹکس لبرکنیٹ اور اس کے طریق استعمال کی وضاحت کی گئی ہے)

کالٹکس لبری ٹیکشن سروس کے لئے اپنے خوش خلق ڈیلر سے آج ہی تعین وقت کرلیں۔

آپ کی موٹر زیادہ خاموشی اور سکون کے ساتھ چلے گی۔ سفر میں آرام حاصل ہوگا اور موٹر کی زندگی میں اضافہ ہوگا

مارفک

MARFAK
Lubrication
لبری کیشن

کالٹکس ٹ
پٹرولیم پروڈکٹس

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ء۷ — کراچی — ۳

افراد

الگ الگ رهیں گے تو هر فرد کی عقل اپنے مفاد کیلئے کوشاں رهیگی

اس کا نتیجه

مفاد کا تصادم فلهذه مستقل فساد هے۔

اس تصادم مفاد کا حل

یه هے که تمام افراد کی ضروریات زندگی کی فراهمی کی ذمه داری

معاشره پر هو۔ اس طرح تمام افراد معاشره

ایک گھرانے کے فرد

بن جائیں گے۔

قرآن ایسے هی معاشرے کا تصور پیش کرتا هے۔

اس کا واضح نقشه

☆ نظام ربوبیت ☆

(از- پرویز)

میں ملیگا۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھه روپے

قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم اداره طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.

Editor: KHURSHID ALAM